قائداعظم لائبریری کا شش ماہی ادبی مجلّہ ۲۰

دورِ جدید

مخزن

لاہور

مدیر: شہزاد احمد

قائداعظم لائبریری، شاہراہِ قائداعظم، باغِ جناح، لاہور

مخزن

شمارہ مسلسل ۲۰

۲۰۱۰ء

جلد ۱۰ شمارہ ۲

مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

اراکین

انتظار حسین | ڈاکٹر سلیم اختر
ڈاکٹر انور سدید | امجد اسلام امجد
ڈاکٹر طاہر تونسوی | ڈاکٹر تحسین فراقی
ڈاکٹر خورشید الحسن رضوی | ڈاکٹر تبسم کاشمیری

شہزاد احمد (مدیر اعزازی)

معاونین

محمد ہارون عثمانی

مسز ذکیہ مراد

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری، لاہور

فون نمبر: ۹۹۲۰۱۰۰۷ فیکس: ۹۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qallahore@gmail.com

ویب سائٹ: www.qal.org.pk

کمپوزر: محمد اکرام الحق

طابع: قومی ایڈورٹائزنگ، رائل پارک، لاہور

صفحات: ۱۶۸

قیمت: ۱۰۰/- روپے

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے روانہ کیجیے۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

(۵) اس شمارے کے مضامین پر اپنی رائے سے نوازیں۔

ترتیب

اداریہ		۵

شخصیت وفن

۱۔ ممتاز افسانہ نگار فرخندہ لودھی (مرحومہ) اوران کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق	ڈاکٹر انور سدید	۷
۲۔ تیرا لمیا شہرلاہورنی	افضل توصیف	۱۲
۳۔ محترمہ فرخندہ لودھی: کتاب دار اور ادبی شخصیت	عبدالوحید	۱۴
۴۔ کہانی زندہ ہے	نسیم بانو	۱۹

تحقیق وتنقید

۱۔ ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں کا تصور استاد اور غالب کا رویہ	جاوید رحمانی	۲۱
۲۔ اقبال کی تاریخی تلمیحات	ڈاکٹر بصیرہ عنبرین	۳۲
۳۔ ادب اور پنجاب	ڈاکٹر سلیم اختر	۴۳
۴۔ تصور زمان ومکان۔ عراقی سے عین القضاۃ تک	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۵۰
۵۔ مجید امجد کی شعری کائنات	ڈاکٹر محمد اصغر یزدانی	۵۳
۶۔ نواب شیخ غلام محبوب سبحانی اور انجمن پنجاب اور انجمن اتحاد کے مشاعرے	پروفیسر حنیف شاہد	۷۰
۷۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمان عورتوں میں تعلیمی بیداری کے مراحل اور حکومتی کوششیں (۱۹۱۴ تا ۱۹۴۷ء)	مسز ساجدہ شبیر	۸۷

مکتوبات

۱۔ ضیا محمد ضیا کے خطوط راقم کے نام	ڈاکٹر محمد سرور رانا	۹۹

تصانیف وتالیفات

۱۔ اردو کاریس کی بنیاد پر تیار کردہ پہلا اردو۔انگریزی لغت	حافظ ڈاکٹر صفوان	۱۱۰
۲۔ نقوشِ نظر۔پروفیسر محمد انصاراللہ کے نثری کاموں کی سرسری فہرست	محمد انصاراللہ	۱۱۹

مفصل تبصرے

۱۔ سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن	پروفیسر اصغر عباس	۱۴۲
۲۔ تہذیبی خلاء کا تخلیقی اظہار۔''الواح'' از ڈاکٹر وحید قریشی	سفیر حیدر	۱۵۱
۳۔ دشتِ سوں، ''فنا سے بقا تک''	مشتاق احمد بیگ	۱۵۵
۴۔ حسن کوزہ گر۔تحسین راشد کے نیم تحقی گوشے	ڈاکٹر عزیز ابن الحسن	۱۶۲
قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی خدمات	ذکیہ مراد	۱۶۵
۱۹ ویں شمارے کے قلمی معاونین		۱۶۸

اداریہ

'مخزن' دورِ جدید کا بیسواں شمارہ ایسی صورتِ حالات میں اشاعت پذیر ہو رہا ہے کہ دنیا ے اردو بیسیوں بحرانوں میں گھری ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ گذشتہ شمارے کے اجرا پر سابق مدیر ڈاکٹر وحید قریشی کی وفات ہوئی تھی اور اب کے محترمہ فرخندہ لودھی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انیس ناگی اور محترم محسن احسان جیسی بلند پایہ اور نا قابلِ فراموش ہستیوں کے بچھڑنے پر نوحہ کنانی جاری ہے۔ دنیا ے ادبِ اردو ان کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا گو ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا تحقیقی مضمون گذشتہ شمارے کا تسلسل ہے، ایک تو انھیں ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم کے ضمن میں مضمون رقم کرنا تھا اور دوسرے انھوں نے تصورِ زمان و مکان کے جرم میں قتل کیے جانے والے وحدت الوجودی صوفی عین القضا کے رسالے ''غایۃ الامکان فی درایۃ المکان'' کے بارے میں صراحت فرما دی ہے، جو کہ مادّی اور روحانی اشیا کے فرق کی وضاحت پر مبنی تھا۔ یوں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے مضمون بہ عنوان ''مکاتیب ڈاکٹر وحید قریشی بہ نام نذر صابری'' پر مبنی بحث کا سلسلہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے مجموعۂ کلام 'الواح' کے حوالے سے سفیر حیدر کا تبصرہ خاصے کی چیز ہے، جو انھیں تحقیق و تنقید کی طرح تخلیق کے میدان میں بھی ایک قد آور شخصیت کے طور پر سامنے لانے میں معاون ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون بعنوان ''ادب اور پنجاب'' نہ صرف زبان کی بابت محققانہ خصوصیت کا حامل ہے، بلکہ ثقافتی تاریخ کے کئی بے ربط ڈانڈوں کو ملانے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے، مزید برآں یہ پاکستانی پنجاب کے علاوہ بھارتی پنجاب کی تہذیبوں کا جائزہ لینے کی کوشش کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر کوشش ہے۔

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کا تحقیقی مضمون ''اقبال کی تاریخی تلمیحات'' اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی تلمیحات کے زیرِ اثر روایتی تلمیحوں کو جدتِ معنوی عطا کی۔ اقبال کا شاعرانہ کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہ یک وقت اسلامی ہندوستانی اور غیر اسلامی تلمیحات کا استعمال اس طرح سے کیا کہ اپنے قاری کو یکساں تاثر فراہم کر دیا ہے۔

'اپنے باپ کے نام خط' کی وساطت سے سید سفیر حیدر نے فرانز کافکا کے پدری دباؤ اور خوف سے معمور بچپن کے تناظر میں اس کے ذاتی اور تخلیقی رویے کا عمدگی سے تجزیہ کیا ہے، جو اردو کے ادبی اور نفسیاتی ذخیرے میں اضافے کا موجب مضمون ہے۔

ڈاکٹر محمد سرور رانا نے ''ضیا محمد ضیا کے خطوط راقم کے نام'' کے عنوان سے اردو اور فارسی کے ایک قابلِ ذکر ادیب و محقق کے

خطوط ترتیب دیے ہیں، جن کے مطالعے سے ایک استاد کا اپنے شاگرد کے ساتھ مخلصانہ علمی تعلق کی مخلصانہ سطح کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پروفیسر محمد انصاراللہ کے تالیفی، تحقیقی اور تخلیقی کام تاریخ اردو ادب میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ گو ان کے بارے میں مرتب کردہ الحاج محمد انصاراللہ کی فہرست بعنوان ''نقوشِ نظر'' ہر طرح سے مکمل اور حتمی قرار نہیں دی جا سکتی کہ ان کے کئی ایسے مضامین اس میں درج نہیں ہیں جو مشیر کراچی، تذکرہ کراچی، لوح و قلم پشاور وغیرہ جیسے متعدد ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے، تاہم یہ فہرست محققینِ ادب و زبان کے تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ مزید برآں اس میں پروفیسر محمد انصاراللہ کے تبصرے اور کئی دیگر تحریریں بھی شامل نہیں ہیں۔

مسز ساجدہ شبیر ماہرِ تعلیم ہیں، ان کا مضمون بعنوان ''قیامِ پاکستان سے پہلے مسلمان عورتوں میں تعلیمی بیداری کے مراحل اور حکومتی کوشش (۴۷ـ۱۹۲۰ء) اس اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ہمیں برصغیر میں خواتین کی شعوری اور علمی ترقی کی تاریخ شناسی کرواتا ہے۔

''وشت سوس، فنا سے بقا تک''۔ مشتاق احمد بیگ کا یہ تنقیدی مضمون جمیلہ ہاشمی کے ناول سے وجود پانے والے تاریخی استدلال، عشقِ بے مثال اور تصورِ فنا و بقا کی رنگا رنگ تلون سے وجود میں آیا۔

''مجید امجد کی شعری کائنات ـــ ایک جائزہ'' ڈاکٹر محمد اصغر یزدانی کا مضمون، جدید نظم کے طرزِ احساس کی تفہیم کے حوالے سے بھی مبسوط تبصرے کا حامل ہے۔

''اردو کارپس کی بنیاد پر تیار کردہ پہلا اردو ـ انگریزی لغت'' (اشاعت اول کا ابتدائیہ) ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان اور سید محمد ذوالکفل بخاری کی خصوصی کاوش ہے۔ دو زبانی اردو ـ انگریزی لغت کی تیاری اور تکمیل کے منصوبے کی تمام تر جزئیات سے آگاہی کے علاوہ اس اہم منصوبے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

گو ہم قومی سطح پر اردو زبان کو ابھی تک نہ تو دفتری سطح پر نافذ کر پائے ہیں اور نہ ہی اسے حصولِ معاش کا وسیلہ بنا سکے ہیں، باوجودے کہ اس میں اتنی توانائی اور نامیہ ہے کہ یہ خود روطریق پر عالمی ادبیات کے شانہ بہ شانہ چلتی ہوئی خود کو منوا سکتی ہے۔ تاہم اپنے تئیں ہم مقدور بھر سعی کر رہے ہیں۔

شہزاد احمد

ممتاز افسانہ نگار فرخندہ لودھی (مرحومہ)
اور ان کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق

انور سدید

اردو اور پنجابی زبان کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس فرخندہ لودھی ۵ مئی ۲۰۱۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئیں۔ اس صدی کے آغاز میں ان پر فالج کا پہلا حملہ ہوا تھا، لیکن اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے انھوں نے اس حملے کو نہ صرف پسپا کر دیا بلکہ اپنی صحت کو اس طرح بحال کیا کہ وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں بھی بے حد فعال ہو گئیں، اس دور میں انھوں نے اپنے اردو افسانوں کا پانچواں مجموعہ ''جب بجا کٹورا'' شائع کیا۔ پنجابی افسانوں کی کتاب ''کیوں؟'' مرتب کر کے چھاپی اور ساڑھے چار سو سے زائد صفحات کا پنجابی ناول ''جنڈ دا انگیار'' تخلیق کیا اور اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا۔ ان پر فالج کا دوسرا حملہ قریباً آٹھ سال کے بعد ۲۰۰۹ء کی آخری ششماہی میں ہوا۔ دایاں بازو مفلوج اور قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ زندگی محفوظ رہی ہے اور فالج کے اثرات آہستہ آہستہ رفع ہوں گے۔ چناں چہ فرخندہ لودھی ہسپتال سے گھر آ گئیں اور اپنی قوتِ ارادی سے حسبِ سابق اپنی صحت کو بحال کرنے لگیں۔ ان کے شوہر پروفیسر صابر لودھی واپڈا ٹاؤن سے لمحے لمحے کی خبر مجھے ٹیلی فون پر دیتے اور ہمیشہ کہتے کہ فرخندہ اپنی بیماری پر فتح یاب ہو جائیں گی، لیکن یکم مئی کو ان کا فون آیا تو ان کی آواز میں سراسیمگی تھی۔ کہہ رہے تھے ''فالج نے تیسری بار حملہ کر دیا ہے اور فرخندہ کو ہسپتال میں منتقل کیا جا رہا ہے۔'' اس کے بعد ان کے تمام ٹیلی فون ہسپتال سے آئے لیکن امید کی کرنیں مسلسل ڈوبتی محسوس ہوئیں۔ ۵ مئی کی شام کو چھ بجے ان کا فون گھر سے آیا تو وہ کہہ رہے تھے:

''فرخندہ دنیا کے تمام عذابوں سے نجات حاصل کر گئی ہے۔''

میرے تو آنسو نکل آئے لیکن نصف صدی کی مثالی ازدواجی زندگی کے اس دردناک انجام پر وہ حوصلہ نہیں ہارے تھے۔ شاید درد حد سے گزر چکا تھا اور اب دوا بن گیا تھا۔

فرخندہ لودھی ۲۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو متحدہ پنجاب کے شہر ہوشیار پور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد حق نواز کا تعلق ککے زئی خاندان سے تھا۔ پولیس کی ملازمت نے ان کے مزاج میں حاکمانہ قاہریت اور جبریت پیدا کر دی تھی۔ فرخندہ ان کی نامطلوب تیسری بیٹی تھی۔ وہ اس کی پیدائش پر ایک اور بیٹے کے خواہش مند تھے۔ بیٹی پیدا ہو گئی تو اسے ہمیشہ قہر کی جابرانہ نظروں سے دیکھا اور اپنی شفقت سے محروم رکھا۔ فرخندہ کی تربیت و تعلیم ان کی والدہ کی مرہونِ منت تھی۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو یہ خاندان ہوشیار پور

سے ہجرت کر کے منٹگمری (حال ساہی وال) آ گیا، جہاں فرخندہ کے بڑے بھائی عبدالعزیز پولیس میں ملازم تھے۔ عسرت کے اس دور میں فرخندہ کالج کی تعلیم مکمل نہ کر سکیں اور لائبریری کا ڈپلوما لے کر لاہور سے عملی زندگی کا آغاز کر دیا۔ انھوں نے ملازمت کے دوران ایم اے اردو کر لیا لیکن انھیں لیکچرر شپ کی پوسٹ سے محروم رکھا گیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں ۱۹۹۸ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائر ہوئیں تو چیف لائبریرین کے عہدے پر فائز تھیں۔ ایک روایت کے مطابق اپنی لائبریری کی پرانی کتابوں کی صفائی اور آرائش میں فرخندہ نے ذاتی طور پر اتنی محنت کی کہ کتابی جراثیم اور گرد ان کے پھیپھڑوں پر جم گئی اور یہی فالج کے حملوں کا باعث بن گئے۔ صابر لودھی ان کی ازدواجی زندگی کے ساتھی تھے۔ ان کی زندگی اتنی مثالی تھی کہ فرخندہ کی معاصر خواتین ان پر رشک کرتیں اور پوچھتیں ''شوہر کو مہربان کرنے کا نسخہ ہمیں بھی بتاؤ۔''

میرا فرخندہ سے کوئی نسبی رشتہ نہیں تھا۔ ان کے پہلے افسانے ''پارتی'' کی اشاعت پر ان سے ادبی تعلق پیدا ہوا تو یہ نسبی تعلق سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ ان کے اصرار پر ہی میں لاہور منتقل ہوا تھا۔ میرے پانچ مرلے کے محل کی تعمیر ان کے پڑوس میں شروع ہوئی تو اس کی بنیاد کی پہلی اینٹ فرخندہ نے رکھی تھی۔ میں نے اپنی ایک کتاب ''غالب کا جہاں اور'' کا انتساب اس پہلی اینٹ کے نام کیا تھا۔ فرخندہ لودھی نے اس مکان کی تعمیر کے دوران میرے دو بچوں۔۔ امتیاز اور بذل ندیم کو ماں کی محبت دی۔ ان کی شادیوں میں شریک ہوئیں اور ان کی بیٹیاں پیدا ہوئیں تو انھیں سونے کے بُندے پہنائے۔ عارفہ اور سعدیہ کو ہمیشہ بہو کہہ کر پکارتیں۔ میرے لیے ان کی موت المناک صدمہ ہے۔ صابر لودھی صاحب نے اپنی بیگم کو اور میں نے اپنی بہن کو جو مجھے خونی رشتوں سے زیادہ عزیز تھی، اس دنیا سے بادیدۂ نم رخصت کیا۔ ہم دونوں بے الفاظ زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے: ''کیا اس کا بگڑتا جو نہ مرتی کوئی دن اور''۔

لائبریرین شپ فرخندہ لودھی کا پیشہ ورانہ شعبۂ حیات تھا، لیکن ادب ان کا عشق تھا۔ اس عشق کا آغاز تو بچپن میں ہی ہو گیا تھا جب وہ اپنی تختی پر ''ایک دفعہ کا ذکر ہے'' لکھ کر نئی کہانی تخلیق کر ڈالتی تھیں۔ ہجرت کے تجربے نے ان کو انسانی بربریت کے خوں رنگ مشاہدات سے گزارا۔ ان کی پہلی کہانی ''پارتی'' اسی تجربے کا عکس تھی۔ انھوں نے زندگی کی متعدد قاشوں کو اردو اور پنجابی افسانوں کا روپ دیا اور زندگی کے ''کُل'' کو اجتماعی سطح پر ناول ''حسرتِ عرضِ تمنا'' (اردو) اور ''جنڈ وا نگیار'' (پنجابی) میں پیش کیا۔ انھوں نے اردو میں افسانوں کے پانچ مجموعے ''شہر کے لوگ''، ''آرسی''، ''رومان کی موت''، ''خوابوں کا کھیت'' اور ''جب کٹورا بجا'' اور پنجابی میں تین مجموعے ''چنے دے اوہلے''، ''ہردے وچ تریڑاں'' اور ''کہوں'' پیش کیے۔ تین سال قبل صدر پاکستان نے ان کی ادبی خدمات پر ''تمغاے حسنِ کارکردگی'' (Pride of Peformance Award) عطا کیا تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کو پاکستانی ادب کے معماروں میں شامل کیا اور اکادمی کے صدر نشین فخر زماں صاحب نے ان کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب لکھنے کا اعزاز مجھے عطا کیا۔ دکھ یہ ہے کہ فرخندہ لودھی اس کتاب کو چھپی ہوئی صورت میں نہیں دیکھ سکیں۔ اس کتاب کے پروف پڑھے جا رہے تھے کہ انھوں نے اپنا رختِ حیات سمیٹ لیا۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے دوران مجھے فرخندہ لودھی کی چند ذاتی فائلوں کو دیکھنے کا موقع بھی ملا اور ایک دلچسپ چیز جو دستیاب ہوئی وہ ان کی ذاتی ڈائری تھی۔ فرخندہ نے یہ ڈائری باقاعدگی سے نہیں لکھی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ افسانہ اور ناول تو تخلیقی

وفور کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسے لکھے بغیر تخلیق کار کے باطن میں ابلتا ہوا آتش فشاں رو بہ اعتدال نہیں ہوتا۔ لیکن ڈائری کے لکھنے میں شعوری ارادے اور آورد کا عمل بھی شامل ہے اس لیے ڈائری کی تحریر میں نہ صرف وقفے آ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات ڈائری نویس روزنامچہ لکھنے سے اکتا بھی جاتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ڈائری لکھنا ذاتی ذوق اور شوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فرخندہ لودھی نے کسی خصوصی شوق کے تحت ڈائری نویسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ان کی صرف ایک ڈائری دستیاب ہوئی جو ۱۹۸۳ء کے مختلف ایام میں لکھی گئی تھی۔ یہ ڈائری اشاعت کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھی اور یہ ایک ایسی خود کلامی ہے جس میں فرخندہ لودھی سماجی تاثر، حالات زمانہ، ذاتی حوادث اور واقعات کا تذکرہ، ادب اور ادیبوں کے بارے میں آرا سب کچھ لائی ہے۔ اور یہ ڈائری ہمیں ان کے ذہن کے داخلی جزیروں تک رسائی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ میں یہاں ان کی خلوت میں داخل ہو کر ان کے چند ذاتی تاثرات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں:

ہفتہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۳ء

''محبت اور پتنگ کی اڑان میں کتنی مماثلت ہے؟''

اتوار ۳۰ جنوری ۱۹۸۳ء

''میرے لیے آج کا دن اس لیے اہم ہے کہ میں آج بھی زندہ ہوں۔ گزرے ہوئے کل کی کوئی وقعت نہیں کیوں کہ کل میں نے کوئی تعمیری کام نہیں کیا۔''

سوموار ۱۴ فروری ۱۹۸۳ء

''ڈاکٹر میمونہ انصاری کی تصنیف ''پھول اور پتھر'' ایسی تخلیق نہیں جسے پتھروں کی ضرورت ہو۔ بس ٹھیک ہے۔ آپا جمیلہ ہاشمی نے کہا تھا: ''یہ ناول دو گھنٹوں کے مطالعے کی مار ہے۔ بیٹھ کر پڑھ چھوڑو'' ......مگر میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں کوئی شے بھی وقت کا حساب رکھ کر نہیں پڑھتی۔ میمونہ انصاری نے اس پر تبصرہ کرنے کے لیے ٹیلی فون پر حکم دیا ہے۔ موصوفہ لاہور کالج میں استاد ہیں۔ انھیں حکم دینے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور مجھے کسی کا دل توڑنے کی عادت نہیں پڑ سکی۔ ناول شروع کیے آج آٹھ دن ہو گئے ہیں مگر ختم نہیں ہو سکا۔ آج تو میں پہلے کرنل غلام سرور کا مضمون پڑھوں گی کیوں کہ یہ انھوں نے فوٹو کاپی کرا کے بھیجا ہے اور میرے پیشے سے متعلق ہے۔''

جمعہ ۱۸ فروری ۱۹۸۳ء

''ڈاکٹر وزیر آغا، غلام الثقلین نقوی اور سجاد نقوی تشریف لائے۔ وزیر آغا پڑھا لکھا، باشعور اور بے حد اور جنل (Orignal) محقق ہے۔ اس کی سنجیدگی پر شک نہیں۔ اگر یہ شخص خوف زدہ نہ ہوتا تو پاکستان کا برٹرنڈ رسل ہوتا۔ میں حاکموں سے زیادہ محکوموں سے ڈرتی ہوں۔ کیوں کہ محکوموں میں بے ضمیروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔''

ہفتہ ۱۹ فروری ۱۹۸۳ء

”پنجاب پبلک لائبریری گئی تھی۔ پتا چلا کہ امریکا سے عاتکہ صدیقہ آئی ہوئی ہے۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ عاتکہ میرے بچپن کی کلاس فیلو ہے۔ سنا ہے اس نے شادی کر لی ہے۔ اس عمر میں؟ اللہ خیر کرے! کرنا ہی تھی تو پہلے وقت میں کر لیتی۔ شادی کوئی نماز نہیں کہ قضا بھی پڑھی جائے۔“

بدھ ۲۳ فروری ۱۹۸۳ء

”آپا جمیلہ ہاشمی نے میری عزت افزائی کی کہ مجھ ناچیز کو اشفاق احمد اور ممتاز مفتی جیسے استادانِ فن کی محفل میں افسانہ سنانے کا موقع دیا۔ اشفاق احمد اور ممتاز مفتی نے نہایت فنکاری اور پرکاری کے ساتھ عام سی بات کو بہترین بیان کے ساتھ کیا سے کیا بنا دیا۔ آغا سہیل کی کہانی علامتی تھی۔ علامتی کہانی مجھے ہمیشہ بناوٹی لگتی ہے۔ آغا سہیل پرانے لکھنے والے ہیں۔ سامعین کو بھٹکنے دیتے ہیں بھلا۔۔۔ ساتھ چمٹائے رکھا۔ امِّ عمارہ کی طویل کہانی تاثر کے لحاظ سے بہت اچھی اور سچی تھی۔ البتہ یونس جاوید کی کہانی نامعلوم کیا تھی۔ بعض اوقات لکھنے والا کچھ زیادہ ہی تکلف برت جاتا ہے۔ سنا ہے انتظار حسین بھی کہانی لے کر آئے تھے، نہ جانے سنانے سے کیوں گریز کیا؟ بہر حال شامِ افسانہ دھواں دھار اور مسلسل بارش میں بھی پُرکیف رہی۔ تقریباً تمام مدعوئین موجود تھے۔ یہاں تک کہ بھٹو کا نیم قاتل اعجاز بٹالوی بھی تھا۔ لوگوں نے اسے کشادہ دلی سے خوش آمدید نہیں کہا۔ وہ الگ تھلگ بیٹھا رہا۔“

بدھ ۲۰ اپریل ۱۹۸۳ء

”زندگی بیکار گزری۔ میں نے اسے کارآمد بنانا چاہا مگر ہر مقام پر ایسے لگا جیسے میرے بس میں کچھ نہیں۔ نئے لکھنے والوں کی کھیپ آ گئی ہے۔ میرے قلم کو چلنے کی فرصت زمانے نے کم کم دی ہے۔ روزی کمانے کی فکر، حلال روزی کمانے میں انسان جتنا ذلیل ہوتا ہے یہ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ تجربے نے بتایا کہ انسان کے پاس پیسا ہونا چاہیے۔ خواہ وہ کسی ذریعے سے آئے ورنہ زمانہ منہ نہ لگائے۔
میں دنیا کی ناکام ترین انسان ہوں۔ اس لیے کہ میں نے جدوجہد کی۔ شاید یہ پازیٹو (Positive) نہیں تھی۔ مگر میں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ قدم قدم پر خون کیا تو اپنا۔“

منگل ۳ مئی ۱۹۸۳

”ادیب کی زندگی میں وہ مقام خدا کرے کبھی نہ آئے جب وہ یہ سوچنے لگے کہ میں کچھ ہوں۔“

اتوار ۲۹ مئی ۱۹۸۳ء

”کاش! مشینوں کی ایجاد اور استعمال کی حد مقرر کر دی جائے تاکہ انسان اپنی اور خدا کی ذات پر اعتماد کی دولت سے محروم نہ ہو جائے۔ جینے کا حاصل کیا ہے؟ اعتماد۔ صرف اعتماد۔“

بدھ یکم جون ۱۹۸۳ء

"ہماری ضروریات ایک دوسرے کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں اور ہم صرف اپنے لیے زندہ ہیں۔ میں بہ حیثیت پیشہ ور ایک لائبریرین ہوں۔ اور میں کسی کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ناکامی میرا مقدر ہے۔ کتاب کسی بھی معاشرے کی بنیادی ضرورت نہیں۔ میں کسی کو ایکسپلائٹ (Exploit) نہیں کر سکتی۔ آدمی وہ کام کرے جس میں اسے اپنی حیثیت کے اثرات کا پتا ہو۔ ایک لائبریرین سے ایک خاکروب بہتر ہے جو با اثر تو ہے۔"

بدھ ۱۳ جولائی ۱۹۸۳ء

"میں تنہائی اور سکون کے کھوج میں ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں چیزیں مجھے قبر سے پہلے نصیب نہیں ہوں گی۔ کتنی کہانیاں اور کتنے چونکا دینے والے موضوعات میرے حافظے میں ہیں۔ مگر یکسوئی کہاں؟"

اتوار ۱۳ نومبر ۱۹۸۳ء

"آج ہم نے مارشل لا کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ (Writ) داخل کر دی ہے۔ خدا کرے کہ فیصلہ حق کا ہو۔ مارشل لا چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ٹانگیں اڑاتا پھرتا ہے۔ کبھی ڈنڈے والے، کبھی بندوق والے ہانکے پھرتے ہیں۔ رعایا غریب گدھوں کی منڈی ہے۔"

یہ فرخندہ لودھی کی روزمرہ سوچ کے چند اوراق ہیں جو ان کے افسانوں میں کرداروں کے وسیلے سے مصور ہو گئے ہیں۔

مجھے ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی قرارداد پر بھروسہ رہا ہے مگر یہ معاہدہ عزت مندانہ ہونا چاہیے نہ کہ ایسا جو ایک کی بقا اور دوسرے کی فنا پر منتج ہو۔ بدقسمتی سے کانگرس کے مختاران اعلیٰ (کانگرس ہائی کمانڈ) اس امر کے لیے تیار نہیں کہ ہمارا دست رفاقت اپنے ہاتھ میں لیں بلکہ ان کے بس میں ہو تو وہ اسے جلا کر خاک کر ڈالیں۔ اس وقت تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے مگر دونوں فرقوں کا اتحاد عین ممکن ہے۔ البتہ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ امید کب پوری ہوگی۔ ہمیں دو شدید دشمن قوموں کے باہمی سمجھوتہ کی ایک تازہ مثال جرمنی اور روس کے اتحاد میں ملتی ہے۔ میں ہر مسلمان سے کہتا ہوں کہ اسلام ہم سب سے اس فرض کے ادا کرنے کی توقع رکھتا ہے کہ ملت اسلامیہ بطور قوم متحدہ کے مددگار رہوں۔

(ارشادات جناح، ص ۷۷)

تیرالٹیا شہر لاہورنی!

افضل توصیف

فرخندہ لودھی پنجاب میں نہ ہو تو پنجاب ادھورا ہو جاتا ہے۔ پنجاب ادھورا ہو چکا، بہت سے ایسے لوگ جاچکے جو پنجابی ادب کو زندہ اور تازہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دنیا جو پارٹیشن کے بعد، جب کہ لاہور اصلی پنجابی باشندوں سے خالی ہو گیا تھا، ادب کی دنیا بھی گھاٹے میں چلی گئی۔ مگر پنجابی زبان و ادب کو تو بہت زیادہ نقصان ہونے کا احتمال تھا، کیوں کہ پنجاب کا اَپ سٹارٹ حکمران طبقہ پنجابی زبان و ادب کی قدر پہچاننے سے منکر تھا۔

ایسے میں یہاں ایک گروہ نئے لکھاریوں کا آگے آیا اور انھوں نے نیا پنجابی ادب تخلیق کرنا شروع کیا۔ مگر ان کو ایک بات بھی سننا پڑی کہ پنجابی میں لکھنے والے شاید اردو میں تیز نہیں ہوتے۔ فرخندہ کے اندر ایک جینئس تھا۔ اس نے چیلنج قبول کیا اور دونوں زبانوں میں لکھنا شروع کیا اور آج تو اس کے کام کے دونوں پلڑے بھاری ہیں۔ شہر کے لوگ، جنڈ دے انگیار۔ فرخندہ نے بہت کچھ لکھا۔ کہانی میں اس کا رجحان زیادہ رہا۔ دراصل کہانی ہی ادب کی بنیاد ہے۔ پرانے اور کلاسیکل فنکاروں نے شعری زبان میں کہانیاں لکھیں۔ فرخندہ نے کہانیاں لکھیں ناول لکھے اور اب تو شاعری کی طرف بھی اس کا دل مائل تھا۔ ایک تخلیقی ہستی!

کتنے ہی کام کرتی تھی وہ۔ ملازمت کے سال پورے کیے، مکان بنایا، گھر بسایا۔ فرخندہ کے اپنے بچے نہیں ہوئے۔ مگر کیوں نہیں تھے، اس نے کتنے بچے پالے اور پڑھائے۔ پورے چاؤ لاڈ کے ساتھ تین بیٹیوں کی شادیاں کیں اور بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی تمنا کر رہی تھی اور ہاں۔ فرخندہ لودھی میں تعمیری جذبہ اور جرأت بھی بہت تھی۔ اس نے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بھی بنائی تھی۔ وہ سیاسی ذہن رکھتی تھی، جمہوریت کی حامی اور جمہوریت کی بربادی پر بہت رنجیدہ ہو جاتی۔ برے وقت ہم نے ساتھ ساتھ دیکھے۔

فرخندہ اسی علاقے میں پیدا ہوئی تھی جس میں منیر نیازی پیدا ہوئے تھے اور اشفاق احمد اور خود میں بھی اسی ضلع ہوشیار پور دوآبہ میں جنمی تھی۔ جانے کس نے کہا تھا ہوشیار لوگوں کی دھرتی ہے۔ اور دوآبہ بست جلندھر: جہاں موتی پیدا ہوتے اور "ہر موتی گھڑے جڈا"، زرخیز دھرتی، ذہین لوگ پیدا کرتی ہے۔ سو فرخندہ لودھی اسی دھرتی کا موتی دانہ تھی۔ مگر زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گزارا، صابر لودھی کی سنگت میں۔ آج جب میں نے صابر لودھی سے کہا: "ایک بات کہو، صرف ایک بات" تو انھوں نے کہا: "فرخندہ کو ایک سال اور جی لینا چاہیے تھا۔ تب میں کہہ سکتا تھا، نصف صدی کا قصہ ہے یارو، کل کی بات نہیں ......! ایک کم پچاس سال ایک ساتھ ایک گھر میں۔ ایک گاڑی میں کبھی تو ایک ہی کالج میں بھی۔ جی سی میں صابر لودھی پروفیسر اور فرخندہ لودھی لائبریرین۔ آج جوڑی ٹوٹ گئی نا۔ فرخندہ نے کوئی بڑا غم نہیں دیکھا۔ ابھی تو بڑی بہن بھی زندہ ہے۔ ابھی تو اس کا قلم بھی رواں تھا۔ مگر اور جیسے جمیل پال کہتا ہے: فرخندہ لودھی کے ساتھ ایک دور کے پنجابی ادب کی خوشحالی کا دور تھا، وہ ختم ہوا۔

''شہر کے لوگ'' زندہ رہیں گے جیسے کہ لیلیٰ خالد نے لکھا تھا ''میرے لوگ زندہ رہیں گے۔'' اور فرخندہ نے جو ورثہ چھوڑا ہے، کیا اسے پنجاب سنبھال کر رکھے گا؟ اس یقین کے علاوہ تو چارہ کوئی نہیں۔ میں نے جو کتاب شہر کے لوگوں پر ترتیب دی اس کا نام ملتا جلتا ہی رکھا ہے۔ ''کیا شہر تھا، کیا لوگ تھے۔'' مگر اس کتاب میں فرخندہ کا نام نہیں ہے کیوں کہ فرخندہ ان لوگوں میں تھی جن کو وہ کتاب پڑھنا تھی اور مجھے تو یہ گمان تھا کہ فرخندہ اس کتاب کو پڑھ کر بہت کچھ کہے گی، لکھے گی۔ اور پھر میں اسے بتاؤں گی کہ مجھے اس کی ایک کتاب کا نام بہت پسند تھا، مگر اتنی بڑی رائٹر کی کتاب کا نام چرایا تو نہیں جا سکتا تھا۔

مگر اس شہر کے لیے اب گھاٹے ہی گھاٹے ہیں۔ اس کی زبان اور تہذیب اور وہ لوگ جو سرمایہ تھے، کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی تنظیم باقی نہیں۔ کوئی مرکز بھی نہیں۔ اور مجھے کوئی یہ کہنے والا بھی نہیں کہ آج کل میں پنجابی کی طرف پوری توجہ کیوں نہیں دے رہی۔

''سال ہو گیا میں سویر وچ تیری کوئی لخت نہیں دیکھی۔''

کتنی اچھی لگتی تھی اس کی یہ جواب طلبی۔

آخری ملاقات، کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھی، بہت سفید لباس، ہونٹوں اور آنکھوں میں مسکراہٹ۔ صابر لودھی نے بتایا کہ صحت میں بہتری آ رہی ہے۔ اور وہ موت کے لیے نہیں زندگی کے لیے سوچ رہی تھی۔ فرخندہ پرائیڈ آف پرفارمنس تھی۔ مگر اس تمغے کو دیکھ کر ہنستی تھی جو ایک سال میں سنہری سے سیاہ ہو گیا تھا۔ ''دو رتی سونے کا پانی پھروا دیتے تو بھرم رہ جاتا۔ مگر خیر، ایک بات میں تو سچے ہیں بے چارے ہر چیز کو اپنی طرح نقلی رکھتے ہیں یہ ہمارے حکمران ابھی بچے ہیں۔''

اب کون کرے گا ایسی کاٹ دار باتیں؟

فرخندہ لودھی نہیں رہی۔ مگر فرخندہ لودھی ہے۔ اس کی کتابیں، اس کی باتیں یاد رہیں گی۔ کم از کم ایک نسل تک تو۔

آج میں اس فورم سے یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ حکومت اور پنجاب حکومت بھی بہت جہالت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ بے شک یہ سب جاہل ہیں۔ ادیب اور جرنلسٹ کا مطلب سمجھتے ہیں نہ فرق۔ ادیب کسی جگہ کی عزت اور خوشبو جیسا ہوتا ہے مگر یہاں پاکستان میں جہاں کہ پرانی قدریں تھیں، اب بالکل ختم۔ ادب لکھنے والا کس حال میں ہے۔ کس مشکل میں؟ دوا علاج اور روٹی رہائش تو کیا، خبر تک نہیں۔ احترام تک نہیں۔

جرنلسٹوں کے لیے کالونیاں بنتی رہتی ہیں مگر اکثر ادیب اپنی کتاب چھپوانے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ دنیا بھر میں خاص کر کے یورپ میں ادب لکھنے والے کی قدر ہے، کیوں کہ یہ کسی سماج کے تمدن کی ترجمانی اور نمایندگی کرتا ہے۔

فرخندہ جیسی ادیبہ پنجابی اور اردو جیسی اہم زبانوں کو ادبی سرمایہ دینے والی بہت دنوں بیمار رہی۔ کسی ادارے کی طرف سے خیر و عافیت نہ پوچھی گئی۔ کوئی تعزیتی تقریب کسی سرکاری ادارے، یہاں تک کہ اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے نہ کی گئی۔ ٹھیک دوسرے دن اکیڈمی صوفی کانفرنس کر رہی تھی۔ مگر اتنی بڑی رائٹر کی وفات کا ذکر تک نہ تھا۔ یہ بھی نہیں کہ سیکڑوں سال بعد بھی رائیٹر زندہ رہتا ہے۔ وہ سب رائیٹر ہی تھے جنھیں صوفی کہا جاتا ہے۔ فرخندہ خود ایک صوفی تھی۔

افسوس کہ حکمران طبقوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آج بدنامی اور گمنامی کے اس منحوس دور میں بھی یہ ادیب اور فنکار ہے جو ملک کا نام نیک رکھتا ہے۔ اور دنیا میں اچھا تعارف دیتا ہے۔

محترمہ فرخندہ لودھی: کتاب دار اور ادبی شخصیت

عبدالوحید

گورنمنٹ کالج لاہور کی چیف لائبریرین محترمہ فرخندہ لودھی وفات پا گئیں۔ اس تعزیتی تقریب کے موقع پر میں سمجھتا ہوں کہ فرخندہ لودھی صاحبہ کو ان کی پیشہ ورانہ خدمات کے عوض اس صورت میں خراج عقیدت پیش کرنا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت اور کارکردگی کی ایک جھلک لائبریری کے پیشے سے متعلق احباب کے سامنے آ جائے۔

فون کی گھنٹی اچانک بجی ٹی وی پروگرام چل رہا تھا اور وہ بھی میری پسند کا لہٰذا ریسور اٹھانے میں تھوڑی سی دیر لگی۔ دوسری طرف جی سی یونیورسٹی کے پی آر او بول رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا آپ کو پتا چلا کہ میڈم لودھی فوت ہو گئی ہیں۔ اور وی سی صاحب نے آپ سے رابطہ کے لیے کہا ہے تا کہ اخبارات کے لیے پریس ریلیز بنائی جا سکے اور ساتھ میں نماز جنازہ جگہ اور وقت کا استفسار کیا ہے۔ پی آر او کا ایک سادہ سا جملہ مجھے ساکت کر گیا۔

محترمہ کے برین ہیمرج کی اطلاع میرے ساتھی لائبریرین نے ان کی موت سے صرف دو روز قبل مجھے دی کہ محترمہ کوما میں ہیں۔ نہ جھکنے والی میڈم لودھی کے بارے میں سن کر بہت دھچکا لگا۔ مگر یقین تھا کہ جیسے پہلی مرتبہ بیماری سے نکل آئی تھیں ان شاء اللہ اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر اس بار ایسا نہ ہوا۔

اسی شام جناح ہسپتال گیا اور دیکھا کہ منٹوں میں بات کی تہہ تک پہنچنے والا دماغ احساسات سے بہت دور ہو چکا تھا۔ ان کی بیٹی اور داماد سے بیماری سے متعلق معلوم کیا۔ پھر آتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے کچھ نا امیدی ہوئی اور میں نے ان کے پیر چومے۔ دو دن بعد جناح ہسپتال میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اللہ تعالیٰ نے کیسی عظیم اور شاندار شخصیات بنائیں اور پھر ان کو فنا کے سفر پر روانہ کر دیا۔ ازل سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ جو لوگ فرخندہ جیسے بے ضرر ہوتے ہیں وہ انسانیت کے لیے ایک تحفہ بھی۔ کیا ان کو ہمیشگی نہیں مل سکتی؟ یہ تو ایک ایسا سوال ہے اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا اور نہ ہی دے گا۔ میں نے فون بند کیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن میں وہ گوشہ روشن ہو گیا جس میں گورنمنٹ کالج لائبریری لاہور کی یادیں محفوظ تھیں۔ جہاں برطانیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے بطور لائبریرین محترمہ لودھی کے ماتحت کام کیا اور بہت کچھ سیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ترقی کے بھرپور سفر کا آغاز تھا۔

پنجابی اور اردو زبان کی معروف ادیبہ، افسانہ نگار، ناول نگار فرخندہ لودھی ہوشیار پور، مشرقی پنجاب کے ککے زئی خاندان میں ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئیں (اگرچہ سرکاری طور پر ان کی تاریخ پیدائش ۲۴ نومبر ۱۹۳۷ء لکھی گئی ہے) زندگی کے ۶۹ برس صابر لودھی کے

ساتھ گزارنے کے بعد ۷ مئی ۲۰۱۰ء کو وطن عزیز کے علمی و ادبی حلقوں اور لائبریرین شپ کے پیشے کو اداس چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملیں۔ تین بھائیوں اور دو بہنوں کے بعد ان کا نمبر چھٹا تھا۔ تینوں بھائی پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ خاکی وردی اور سرخ پٹی والی پگڑیوں نے انھیں بھی جابر اور روایت پسند بنا دیا۔ گھر کے ماحول میں خاموشی اور گہری ہو گئی، یہ خاموشی بھی ایک طرح سے فرخندہ لودھی کے وجود کا حصہ بنی۔ گھٹن، خوف اور سناٹے نے باہر کی کھڑکیاں بند کیں تو اندر ایک دریچہ کھل گیا وہ خواب دیکھنے لگیں۔ انھیں سوچنے کی عادت پڑی اور کتابوں کے مطالعے میں ڈوبے رہنا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ پاکستان بنا تو ہجرت کر کے ساہیوال کی پولیس لائنز روڈ کے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئیں۔ والد پولیس ملازم ہونے کے پس منظر میں اپنا مخصوص مزاج رکھتے تھے، اور دوسری طرف والدہ بے حد اطاعت گزار تھیں اور کسی نہ کسی طرح اپنی بیٹیوں کے تعلیم حاصل کرنے کے شوق کو پورا کرتی رہیں۔ پہلے والد اور پھر والدہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ والدہ کا انتقال ہوا تو محترمہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کر رہی تھیں، بڑی دل شکستگی اور محرومی کے عالم میں۔

فرخندہ لودھی صاحبہ نے گورنمنٹ کالج برائے خواتین ساہیوال سے بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس سے ڈپلوما حاصل کیا اور اگست ۱۹۵۸ء میں کوئین میری کالج لاہور سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ مارشل لا بھی اسی سال لگا۔ اس زمانے میں سانولا رنگ، دلکش قامت، دل میں اتر جانے والی اداس آنکھیں اور غیر معمولی لمبے گھنے بال ان کی پہچان ہوا کرتے تھے۔ زمانے کی گرد نے انھیں دھندلا دیا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ان کے سادہ لباس کی تقلید کی جاتی تھی۔ ساری، پورے بازوؤں کا بلاوز اور بند اونچے گلے کی قمیص کا پہناوا انھوں نے کوئن میری کالج میں عام کیا تھا۔

کوئین میری کالج میں ایک بڑا عرصہ گزار کر انھوں نے اس ماحول سے دو مختصر افسانے گولڈ فلیک اور شہر کے لوگ حاصل کیے اور ایک طویل مختصر افسانہ 'رات کی بانہوں میں' تخلیق کیا جو علامتی سطح پر پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کا ایک زاویہ بن گیا۔ لائبریرین کا پیشہ انھیں صرف ایک افسانہ دے سکا 'ایل او وی ای' (Love)۔ بطور لائبریرین کوئین میری کالج کا دور کسی ترقی کی منزل تک نہ پہنچا سکا، کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب گریجویٹ لائبریرین کو بمشکل چودھویں سکیل کے مساوی تنخواہ ملتی تھی۔ یونیورسٹی اور کالجز کی سطح پر لائبریرین کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ اور تنخواہ سب سے کم تھی۔ پیشہ ورانہ ایسوسی ایشن کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ جناب اسمٰعیل غازی اور جناب جی ڈی شاہ پیشہ کی سربلندی کے لیے شب و روز کوشاں تھے لیکن ایک مربوط جد و جہد کی اشد ضرورت تھی۔ فرخندہ لودھی نے ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کیا اور اسی سال انھوں نے پنجاب کالج لائبریری ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس میں شرکت کی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ۱۹۶۵ء میں ان کا پہلا افسانہ 'پارینہ'، 'اوراق' میں اور گولڈ فلیک 'فنون' میں منظر عام پر آیا، ان دونوں افسانوں کی پذیرائی ادب کے بڑے حلقوں میں ہوئی۔ اس طرح ایک طرف ان کا نام روشن ہوا اور دوسری طرف عزت بھی ملی۔ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ نقوش، اوراق اور فنون کی تمام جلدیں جاوید طفیل اور بشیر موجد کے توسط سے لائبریری کو ملیں۔ جو شاید کسی بھی لائبریری میں مکمل صورت میں موجود نہ ہوں۔ فرخندہ لودھی صاحبہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لائبریریوں کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ اردو اور انگریزی کے قومی اخبارات میں کھینچنا شروع کیا۔ بہت سے صحافیوں نے لائبریریوں اور لائبریریز کے حالات کا رہتر

بنانے کے لیے کالم لکھے۔

ظہیر کاشمیری اور ڈان اور پاکستان ٹائمز کے مدیران کرام نے اداریے بھی تحریر کیے۔

فرخندہ لودھی صاحبہ کی پیشے سے لگن کو دیکھتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں انھیں بلا مقابلہ پنجاب کالج لائبریری ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری منتخب کرلیا گیا۔ یہ ایک اہم آزمائش تھی۔

اس شعبے میں انھیں جابر حکمرانوں سے واسطہ پڑا۔ ملازمت ان کی مجبوری تھی۔ اپنی کارکردگی کے اظہار کی ان میں جرأت نہ تھی۔ چناں چہ اپنی پرنسپلوں کے ساتھ ان کے تعلقات ویسے ہی رہے جیسے فرنگی دور حکومت میں گورے اور کالے کے درمیان رہا کرتے تھے۔ بھٹو دور حکومت میں کالج اساتذہ کے سکیل بہتر بنائے گئے تو کالج لائبریرین حضرات کو تدریسی عملے سے خارج سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ فرخندہ لودھی صاحبہ نے مسلسل ایک سال تک محکمے سے جنگ لڑی، اس وقت کے وزیر تعلیم (ڈاکٹر عبدالخالق مرحوم) اور وزیر خزانہ (حنیف رامے مرحوم) نے فرخندہ لودھی صاحبہ کے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے لائبریرین حضرات کو گزیٹڈ ملازمین کا درجہ عطا کیا۔

اس زمانے میں فرخندہ لودھی صاحبہ نے اپنے استاد ڈاکٹر محمد اجمل (تب وائس چانسلر جامع پنجاب) سے درخواست کی کہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں لائبریری سائنس میں ایم۔اے کی کلاس کا اجرا کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا (۱۹۷۲۔۱۹۷۳ء) جب فرخندہ لودھی صاحبہ کو کراچی یونیورسٹی میں داخلہ مل چکا تھا۔ لیکن وہ پنجاب یونیورسٹی سے ہی ڈگری لینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر محمد اجمل نے دو تین ماہ میں ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ایم۔اے کی کلاس کھولنے کا حکم جاری کر دیا اور فرخندہ لودھی صاحبہ نے ۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی ہی سے ایم۔اے لائبریری سائنس کیا۔ اس زمانے کے کلاس فیلو انھیں آپا کہتے تھے۔

۱۹۷۲ء میں فرخندہ لودھی صاحبہ کی کوششوں سے گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ میں پہلی بار "لائبریریوں کے کردار" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں پاکستان بک کونسل نے معاونت کی۔ پورے پنجاب سے مندوبین شریک ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالخالق وزیر تعلیم پنجاب نے صدارت کی۔ جناب احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، پروفیسر حسن طاہر، ڈاکٹر ممتاز اور خود فرخندہ لودھی صاحبہ نے مقالے پڑھے اور ڈاکٹر عبدالخالق نے لائبریریوں کی اہمیت پر طویل خطبہ دیا۔ اسی اجلاس میں انھوں نے عبدالمجید خان ساجد اور فرخندہ لودھی صاحبہ کو پنجاب ایجوکیشن کونسل کے ممبر نامزد کرنے کا اعلان کیا۔ دونوں لوگ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے تک اس کونسل کے ممبر رہے۔ جو لائبریرین شپ کے لیے ایک بھرپور اعزاز تھا، اور ایسا اعزاز محکمہ تعلیم پنجاب کی تاریخ میں پہلی بار لائبریریز کو ملا۔ ۱۹۷۲۔۱۹۷۳ء میں فرخندہ لودھی صاحبہ نے پی ایل اے کے انجماد کو توڑا۔ پی ایل اے کی بے عملی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے پی ایل اے کی انتظامیہ سے علیحدگی اختیار کی۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے لائبریرین جناب مصباح صدیقی مرحوم کے ساتھ انھوں نے ایک پریس کانفرنس کی اور پی ایل اے کی بے عملی کی مثالیں پیش کیں، نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے الیکشن میں پی ایل اے متحرک ہوگئی۔

۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۴ء تک فرخندہ لودھی صاحبہ علالت اور اپنے ہم پیشہ احباب کی سرد مہری کے سبب ایسوسی ایشن سے لاتعلق رہیں، تاہم گاہے بگاہے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھتی رہیں۔ انھیں ۱۹۸۴ء میں دوبارہ مجبور کیا گیا کہ وہ جنرل سیکرٹری کا عہدہ

سنبھالیں۔فرخندہ لودھی صاحبہ نے دوبارہ جدوجہد کا آغاز کیا۔اس بار کام زیادہ مشکل تھا۔سروس سٹرکچر بنوانا اور انٹر اور بی۔اے کی سطح پر لائبریری سائنس کے مضمون کو شامل نصاب کروانا کٹھن مراحل تھے کہ ان کاموں کی تکمیل کے لیے فرخندہ لودھی صاحبہ کو اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے ساتھ ساتھ (۱۹۸۶ء میں) چار ماہ تک سیکرٹریٹ میں او ایس ڈی کے فرائض بھی انجام دینا پڑے۔سٹرکچر کا کیس بار ہا گیا اور اعتراض لگ لگ کر واپس آ گیا، لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری۔۱۹۹۰ء میں وہ انٹر کی سطح پر لائبریری سائنس کا مضمون متعارف کروانے میں کامیاب ہو گئیں۔اور اپنے کالج (گورنمنٹ کالج برائے خواتین وحدت کالونی لاہور) پنجاب میں پہلی بار لائبریری سائنس کے مضمون کی کلاس کا اجرا کیا۔بعد ازاں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں آئیں تو یہاں بھی یہ مضمون پڑھایا جانے لگا۔۱۹۹۲ء میں فرخندہ لودھی صاحبہ نے سروس سٹرکچر کا کیس ایک بار پھر اوپر پہنچایا جسے آخری منظوری حاصل ہونے میں تین سال لگے۔آخر ۵ دسمبر ۱۹۹۵ء کو وزیر اعلیٰ پنجاب نے سروس سٹرکچر کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔

سٹرکچر منظور ہو گیا مگر سروس رولز کی منظوری کے بغیر یہ نامکمل تھا، چناں چہ فرخندہ لودھی صاحبہ نے اس کے لیے بھی نئے سرے سے صف بندی کی۔ایک سال سات ماہ کی محنت شاقہ کے بعد ۱۴ جولائی ۱۹۹۷ء کو وزیر اعلیٰ پنجاب نے سروس رولز کی منظوری بھی دے دی۔اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے اندازاً تیس سال لائبریری اور لائبریرینز کی بہتری کے لیے جدوجہد میں گزارے۔انھوں نے تیس برس پہلے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ وہ اس پیشے کو باوقار بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گی۔خدا نے ان کو سرخرو کیا، وہ ان لوگوں کے لیے دعا گو رہیں جنھوں نے ان سے تعاون کیا۔بد قسمتی سے ان کی جدوجہد آج کی تاریخ تک منزل مقصود تک نہیں پہنچی جس میں کئی کہانیاں اور کردار پوشیدہ اور کچھ آج بھی یہاں موجود ہیں۔

انھوں نے اپنی ملازمت کے آخری پانچ سال گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری کو سجانے اور سنوارنے میں گزارے، اسی نوے ہزار کتابوں کو کھول کھول کر دیکھا، انھیں صاف کیا پھر صحت منداور بیمار کتابوں کو الگ کیا، پتا نہیں چلا کہ ۷ سال کب اور کہاں گزر گئے۔ اس دوران انھوں نے لائبریری کو جدید تقاضوں کے عین مطابق استوار کیا، بلکہ ایسے لوگوں سے بھی روشناس کروایا جو آج اس عظیم ادارے کی لائبریری کو نہ صرف ملکی سطح پر ایک بہترین لائبریری کے طور پر متعارف کروا چکے ہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی کئی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔یہ سب کچھ یوں ممکن ہوا کہ انھوں نے اپنی ذاتی شخصیت کا عکس ان لوگوں پر اتارا اور بطور منیجر بہترین فیصلے کیے۔

اب ان کی شخصیت کے حوالے سے کچھ باتیں کر لوں:

وہ خوشبو کی دلدادہ تھیں۔انھیں موتیے کے پھول بہت پسند تھے جو کہ ان کی ٹیبل پر بھی باقاعدگی سے نظر آتے، چھوٹی الائچی آپ کو بے حد پسند تھی جو کہ ایک ڈبیا میں آپ کے پاس موجود ہوتی اور خاص خاص لوگوں کو دے بھی دیتیں۔باتوں سے، لباس سے اور ماحول سے خوشبو آئے تو ان کا چہرہ دمک اٹھتا تھا۔گمبھیر اداسی یک دم کہیں غائب ہو جاتی تھی۔غیبت کرنے والوں کے پاس ایک لمحہ نہیں گزارتی تھیں۔ان کے ایک کان کے پردے میں بچپن سے سوراخ تھا، وہ اس کان سے بہت کم سنتی تھیں۔ایسی محفل میں جہاں گلے شکوے ہو رہے ہوں اور انھیں مجبوراً یا حکماً بیٹھنا پڑے تو وہ اپنا یہ کان ادھر کر دیتی تھیں۔ان کی تعریف ہو رہی ہوتی تو بھی یہی بہرا کان خود بخود تعریف کرنے والے کی طرف ہو جاتا تھا۔انھیں چہرے یاد رہتے تھے۔نام کا معاملہ ذرا گڑبڑ تھا۔لیکن یادداشت اتنی تیز تھی کہ فوراً پہچان لیتیں۔

انھیں فطرت سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ جب سرسوں پھولتی اور کپاس کے پھول برف کے گالے بن کر کھیتوں کا جمال بڑھا دیتے تو وہ گاؤں میں ایک ہفتہ ضرور گزارتی تھیں۔ ان کا یہ معمول گورنمنٹ کالج لاہور کے دنوں میں بھرپور انداز سے دیکھا گیا۔ وہ اس لیے کہ کبھی چھٹی نہیں کرتی تھیں۔ جب وہ کچھ دنوں کے لیے لائبریری میں نہ آتیں تو لوگوں کو اندازہ ہو جاتا کہ محترمہ گاؤں شاید ''لودھراں'' گئی ہیں۔

وہ اپنے سے چھوٹوں کو حکم دے کر کسی کام کے لیے نہیں کہتی تھیں۔ دوسروں سے تعاون کرنے کے لیے اس طرح کہتیں جیسے التجا کر رہی ہوں:

''بیٹا! یہ کتابیں رکھ آؤ گے الماری میں!''

''پینے کے لیے پانی لا دو گے.........وغیرہ وغیرہ''

دوسروں کی خدمت کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو احسان مند تصور کرتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں میری تعیناتی اس کی بھرپور مثال ہے۔

وہ خود دھیمی زبان میں بات کرتیں اور کوشش کرتیں کہ دوسرے بھی آہستہ بولیں۔ انھیں سٹاف سے کام لینے کا ہنر خوب آتا تھا۔ وہ کچھ اس انداز میں بات کہتیں کہ کوئی ان کو انکار ہی نہ کر سکتا۔ پروفیسر لودھی سے جس قدر ان کو محبت تھی، بہت کم بیویوں میں نظر آئی۔ انھوں نے زندگی بہت سلیقے سے گزاری۔ کھانے پینے کے آداب ہوں یا ملنے جلنے کے طریقے، انھوں نے سلیقے کا دامن تھامے رکھا۔ ملنے جلنے میں بھی انھوں نے جس رکھ رکھاو کا طریقہ اپنایا وہ جعلی یا مصنوعی نہ تھا۔ انھوں نے خود کبھی بھی کسی سے تعلق نہیں توڑا۔ کپڑوں کے پرنٹ اور رنگ ہمیشہ منفرد پہنے۔ محترمہ نے جہاں بھی رہایش رکھی انھوں نے پھل دار درخت اور پودوں سے بڑی محبت کی۔ جی سی یونیورسٹی کی رہایش گاہ سے جب اقبال ٹاؤن ستلج بلاک گئیں تو اکثر ان کا چھوٹے مکان میں جی نہ لگتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شہر سے ذرا دور ''واپڈا ٹاؤن'' اپنے نئے گھر رہایش اختیار کی۔ یہاں میری چند ملاقاتیں ہوئیں تو ان کو بڑا خوش پایا۔ یہ الگ بات ہے کہ بیماری کے باعث وہ فرخندہ لودھی نظر نہ آئیں، جو ان کی شخصیت کی پہچان تھی۔ لیکن مہمان نوازی میں بالکل ایسے ہی تھیں جو ان کی وجہ شہرت تھی۔

فرخندہ آپا مزاج کے اعتبار سے اگرچہ شہرت کے شوق سے دور رہتی تھیں۔ لیکن ان کا قلم سے سچا رشتہ تھا اور حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کا اعتراف یوں کیا کہ ۲۰۰۴ء میں انھیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی دیا۔ ۲۰۰۱ء میں ورلڈ پنجابی فاؤنڈیشن ایوارڈ اور ۲۰۰۵ء میں ورلڈ پنجابی کانگرس لائف اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ کتابیں اور کتابچے کی تفصیل آپ سب جانتے ہیں۔

زندہ قومیں اپنے محسنین کی خدمات کا اعتراف کرتی ہیں۔ شکریے کے چند الفاظ جدوجہد کی تلخیوں کو قند و نبات میں بدل دیتے ہیں۔ میں اپنی لائبریرین برادری کی طرف سے انھیں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ وہ اس پیشے کو وقار عطا کرنے میں صوبہ پنجاب میں اور گورنمنٹ کالج دونوں میں کامیاب رہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔ انھوں نے ملازمت اور جدوجہد کی صورت میں روشن تاریخ رقم کی۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (آمین)

کہانی زندہ ہے

نسیم بانو

کہانی شروع ہوتی ہے ختم ہونے کے لیے، چاہے اپنی تکمیل سے پہلے ختم ہو جائے یا تکمیل کے بعد۔ جیسے کوزہ گل کا چاک رک جاتا ہے، جیسے کوئی ڈور ٹوٹ جاتی ہے، ویسے ہی کہانی لکھنے والا ہاتھ رک جاتا ہے یا کہانی کہنے والے لوگ مر جاتے ہیں، مگر کہانی ختم ہو کر بھی نہیں مرتی، ختم ہوتے ہوتے کئی اور کہانیوں کو جنم دے جاتی ہے۔ فرخندہ لودھی کی اپنی کہانی ختم ہو گئی مگر اس کی کہانیاں زندہ ہیں کیوں کہ اس کی کہانیاں زندہ رہنے والی ہیں۔ اس نے کہانیوں کو خونِ جگر سے سینچا ہے اور کہانی کو زندگی دی ہے۔

فرخندہ لودھی جوانی میں کیسی تھی، مجھے کیا معلوم؟ شاید بہت باتیں کرنے والی ہو کیوں کہ اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ بات سے بات نکالنے کا فن آتا تھا اور وہ کہانی کہنے کا ہنر جانتی تھی۔ مگر جب میں نے اسے دیکھا وہ چپ کی چادر اوڑھے کسی پیپل کے نیچے نروان کی تلاش میں بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکنوں میں صدیوں کی مسافت کی تھکن تھی، اس کے چہرے کی لکیروں میں دکھ بول رہا تھا۔ پانیوں میں ڈوبی اور دشت سی ویرانی لیے اس کی آنکھیں بول رہی تھیں، اس کی کہانیاں بول رہی تھیں، اس کی کہانیوں میں تخلیق کی کو بول رہی تھی اور اس کی کہانیوں کے کردار بول رہے تھے۔ ''حسرتِ عرضِ تمنا'' کی سپنا فرخندہ لودھی نہیں ہے مگر وہ کہتی ہے:

> ''اُف میں کتنی تنہا ہوں اور تم سب کہاں ہو؟ تم سب جو مجھے زندگی کی راہ میں ملے۔ تم سب قدم گن گن کر میرے ساتھ چلے۔ میں ابھی تک چل رہی ہوں۔ مجھے تمھاری اب بھی ضرورت ہے۔ وہ انسان جھوٹ بولتا ہے جو کہتا ہے مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے جب تنہائی ڈستی ہے تو اس کا زہر کسی کے لیے تریاق بنتا ہے اور کسی کے لیے زہر ہلال۔ میں مرے ہوؤں کو نہیں بلاتی، زندوں کو پکارتی ہوں۔ ان سب کو جن کی آنکھوں میں میں نے خلوص کی ذرا بھی جھلک دیکھی۔'' (حسرتِ عرضِ تمنا)

ساٹھ کی دہائی میں جب کہانی علامتوں کے بوجھ تلے دب رہی تھی۔ لسانی نظریوں اور زبان کے ٹوٹتے ہوئے سانچوں کی کرچیاں اس کے وجود کو چھلنی کر رہی تھیں۔ (ممکن ہے کسی مکتبِ فکر کی نظر سے کہانی کو نئی زندگی مل رہی ہو مگر میری نظر میں تو کہانی مر رہی تھی) تب فرخندہ نے کہانی کو زندگی دی، اس کے کہانی پن کو زندہ رکھا۔ اس نے روایت پرستی کا جرم اپنے سر لیا مگر کہانی کو مرنے نہ دیا۔ گولڈ فلیک، پارہتی، شرابی، بوٹیاں اور حسرتِ عرضِ تمنا جیسی شاہکار کہانیاں اسی دور کی یادگار ہیں۔

پھر آخری عمر میں اس نے اپنی دھرتی ماں کا قرض بھی چکتا کر دیا۔ اس نے پنجاب کی کہانی (جنڈ دا انگیار) لکھی۔ اسے پنجاب

سے اور پنجابیوں سے عشق تھا۔ پنجاب اس کی روح میں بستا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا اور مذہب اور معاشرے کا خیال آڑے نہ آتا تو یقیناً وہ صدیوں کی دیوار پھلانگ کر قدیم پنجاب میں جا بیٹھتی۔ اسے پنجاب سے عجیب طرح کا عشق تھا۔ اس کے ماضی کے سارے رشتے پنجاب کی زمین سے استوار ہوتے تھے۔ اس پر لبرل، لیفٹسٹ اور پاکستان مخالف ہونے کا الزام بھی تھا مگر الزام لگانے والے جھوٹے تھے، فرخندہ سچی تھی، اس کے خواب سچے تھے۔ اس لیے وہ کہتی ہے!

"اب پاکستان کیسا ہے؟

جیسا بھی ہے اس جیسا کوئی نہیں۔

اسے کیسا ہونا چاہیے؟

یہ میرا خواب ہے۔ ایک سیدھے سادے عام شہری کا خواب۔

مجھے اپنے خطے کی تاریخ پر فخر ہے ____ میرے لیے اس تمدن اور تہذیب میں طمانیت ہے ____ اس کی زبان و ادب ہی میرا نطق ہے ____ اس کے لیے خواب دیکھنا میرے لیے تقویت ____ یہ خواب آج نہیں تو کل ____ کل نہیں تو پرسوں ____ پرسوں نہیں تو ____ اترسوں ایک نہ ایک دن معتبر ہوں گے۔

(خوابوں کے کھیت)

۵ مئی کو فرخندہ لودھی مر گئی۔ ۶ مئی کو لوگ ایک فرخندہ لودھی کو مٹی میں دفن کر آئے۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی۔ دوسری فرخندہ لودھی ہمارے دل میں بیٹھی ہے۔ ہمارے اردو اور پنجابی ادب میں بیٹھی ہے۔ ہماری کہانی میں بیٹھی ہے اور اس کی کہانی ابھی جاری ہے۔

سن لیجیے پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی

"میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی، اور صرف اردو۔ جو کوئی آپ کو غلط راستہ پر ڈالے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔"

(خطبات قائد اعظم۔ رئیس جعفری۔ ص ۵۸۶)

ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں کا تصورِ استناد اور غالب کا رویہ

جاوید رحمانی

شبلی فارسی کے زبردست عالم تھے۔ان کی شعرالعجم فارسی ادب کے مطالعے کے سلسلے میں مستند ترین کتاب ہے ان تسامحات کے باوجود جن کی نشاندہی محمود شیرانی نے کی تھی۔شبلی نے شعرالعجم حصہ دوم میں امیر خسرو کے حالات لکھتے ہوئے حاشیے میں لکھا ہے:

''تمام تاریخی واقعات سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زاد ہیں،لیکن والہ داغستانی کو کیوں کر گوارہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو''۔[1]

اس سے ظاہر ہے کہ ہندستانی فارسی گویوں کے ساتھ ایرانیوں کے تحقیر آمیز رویے کا شبلی کو احساس تھا اور وہ اس سے نالاں بھی تھے،لیکن غیر شعوری طور پر شبلی کا اپنا رویہ بھی ہندستانی فارسی گویوں کے ساتھ ایرانیوں سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔وہ خیال بندی،مضمون آفرینی اور دقت پسندی وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس طرز کی ابتدا اور ترقی کے ذمہ دار تو عرفی،ظہوری،جلال،اسیر،طالب اور کلیم وغیرہ ہیں،جن کی بدولت یہ طرز مقبول ہو کر دنیائے شاعری پر چھا گیا۔

''اور چوں کہ اس طرز کی بے اعتدالی سخت مضر نتائج پیدا کرتی ہے،اس لیے ملکِ سخن ناصر علی، بیدل وغیرہ کے قبضۂ اقتدار میں آ گیا،اور اس طرح ایک عظیم الشان سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا''۔[2]

ناصر علی اور بیدل چوں کہ ہندوستانی ہیں اس لیے شبلی کی نظر میں ان کا فارسی پر اجارہ قابل قبول نہیں۔وہ غالب کی فارسی شاعری کے کسی قدر قائل ہیں لیکن غالب کی بیدل سے اثر پذیری کو پسند نہیں کرتے۔وہ لکھتے ہیں:

''شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا۔مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستہ پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی، طالب آملی،نظیری،کلیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا......مرزا غالب نے قصیدہ میں متوسطین اور قدما کی روش اختیار کی،اگرچہ اکثر قصائد میں متاخرین کی بدعتیں بلکہ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں،لیکن اخیر اخیر میں سب کج پیچ نکل گئی،اور بالکل اساتذہ کا رنگ آ گیا''۔[3]

یہاں متاخرین سے مراد گو ہیں جن کی پیروی کا مطلب شبلی کے لیے بدعتیں اور خامیاں ہیں۔ان کے لیے غالب اسی وقت تک قابلِ قبول ہیں جب تک وہ عرفی، طالب آملی،نظیری اور کلیم کی پیروی کرتے رہیں اور تو اور شبلی نے لفظ 'انداز' کے لیے

غالب کی سند کو نا قابلِ قبول لکھا اور کہا کہ وہ اہلِ زبان نہیں ہیں۔[۴]

اوائل ۱۸۹۸ء میں کسی صاحب نے شبلی کو ایک دلچسپ خط لکھا جس میں انھوں نے یہ شکایت کی کہ لوگ عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال اردو میں غلط طریقے سے کر رہے ہیں اور اس طرح بے چاری اردو برباد ہو رہی ہے اور خواہش ظاہر ہے کہ اس کے تدارک کے لیے مولانا شبلی جیسے اشخاص کو کوشش کرنی چاہیے۔ اس خط کی بنیاد پر شبلی نے ایک مضمون بعنوان ''املا اور صحت الفاظ'' لکھا۔ اس مضمون میں شبلی ایک طرف تو یہ لکھتے ہیں کہ:

> ''فارسی زبان میں جب عربی کا اختلاط ہوا تو عربی کے سیکڑوں الفاظ اور جملے شامل ہو گئے فارسی کے شعرا اور نثار عموماً علوم عربیہ میں نہایت مہارت رکھتے تھے، لیکن عربی الفاظ جو انھوں نے برتے، اس قدر غلط برتے کہ آج کم مایہ اردو داں اس سے زیادہ غلطی نہیں کر سکتے تاہم وہی فارسی آج تک مستند اور فصیح اور شیریں سمجھی جاتی ہے۔''[۵]

اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے اور جب کوئی لفظ کسی خاص شکل میں عوام میں رائج ہو جائے تو خواص بھی اسے اسی شکل میں اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسا کچھ تو اس لیے ہوتا ہے کہ عوام میں رائج صورت کو درست کر کے صحت کے ساتھ بولنا چاہیں تو یہ نئی صورت جب تک رواج نہ پا جائے عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اور کچھ اس لیے کہ ''یہ امر زبان کی عزت اور خود مختاری کی دلیل سمجھا جاتا ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ اس میں آئیں تو اسی کے قالب میں ڈھل کر آئیں۔''[۶]

یہاں شبلی نے جو دوسرا نکتہ بیان کیا ہے وہ انتہائی اہم ہے اور پہلا نکتہ انشا کی دریائے لطافت سے ماخوذ ہے اور عام اصول میں تبدیل ہو چکا ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شبلی کی نظر میں بے چاری اردو اس عزت اور خود مختاری کے قابل نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''فارسی اور اردو پر موقوف نہیں ہر زبان میں دوسری زبان کے الفاظ آ کر اصلی حالت پر نہیں رہتے۔ البتہ چوں کہ اردو کوئی مستقل زبان نہیں بلکہ عربی، فارسی، ہندی کا مجموعہ ہے اس لیے اس کو عربی فارسی وغیرہ کے الفاظ پر تصرف کا بہت کم حق حاصل ہے اسلیے جہاں تک ہو سکے اس بات کا التزام زیادہ موزوں ہے غیر زبانوں کے الفاظ صحیح تلفظ اور ترکیب کے ساتھ قائم رکھے جائیں۔''[۷]

حالاں کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اساتذۂ قدیم و جدید نے عربی و فارسی کے بہت سے الفاظ کو اردو زبان میں غلط طور سے برتا اور آج وہی غلط استعمالات فصیح اور بامحاورہ خیال کیے جاتے ہیں۔'' اور پھر وہ اسی قاعدے کی بات بھی کرتے ہیں جو انشا نے دریائے لطافت میں پیش کیا تھا، اگرچہ انشا کا حوالہ نہیں دیتے لیکن یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''ہمارے محترم بزرگ نے جن الفاظ کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً فصحائے اہلِ زبان کے ہاں مستعمل نہیں ہیں، اس لیے ان کے غلط ہونے میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا، بے شبہ ایسے الفاظ کو بہت سختی سے روکنا چاہیے ورنہ

> زبان پر بہت برا اثر پڑے گا، کیوں کہ اگر اس قسم کے الفاظ تحریر و تقریر میں کثرت سے پھیل گئے تو ہر شخص کہاں تک یہ تحقیق کرتا پھرے گا کہ ان میں سے کون فصحا کے نزدیک مقبول ہو چکے ہیں اور کون غیر مقبول۔"[۸]

یہاں پر پہلا سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ جب وہ الفاظ تحریر و تقریر میں کثرت سے پھیل جائیں تو فصحا کے نزدیک مقبول و نامقبول کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ ان کا استعمال عام ہی ان کے اردو محاورے کا حصہ بن جانے کی سند ہے۔ دوسرا یہ کہ شبلی نے جن الفاظ کو سختی سے روکنے کی بات کہی ہے ان میں منفی جیسا لفظ بھی شامل ہے اور 'منافق' بھی، بایں معنی کہ ان صاحب نے، جن کے خط کی بنیاد پر شبلی نے یہ مضمون لکھا ہے، اپنے خط میں "منافق" لفظ کے مذہبی سیاق و سباق سے الگ استعمال کو بھی گردن زدنی ٹھہرایا ہے اور اس کی بنیاد پر 'نفاق' کے استعمال سے بھی ناخوش ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ "بہ جائے نافیہ کے منفی میرے خیال میں غلط ہے۔" اور شبلی صاف لکھ دیتے ہیں کہ ان کے غلط ہونے میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اردو معاشرے کا آیا کوئی اپنا تصورِ استناد ہے بھی یا نہیں؟ اور کیا ہم نے شروع سے اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ یا ہم نے اردو کو بھی وہ آزادی دی ہے جس کو ہم بشمول شبلی زبان کی عزت اور خود مختاری کی دلیل سمجھتے ہیں۔ اور ان باتوں کا سراغ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی فارسی گویوں کے رویے کا بھی تجزیہ کریں۔

فارسی زبان کے بارے میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اس نے محمود غزنوی (۹۹۸۔۱۰۳۰ء) کی سرپرستی میں قدم رکھا۔ محمود غزنوی اور اس خاندان کے دوسرے حکمرانوں کے دورِ حکومت (۱۰۳۰ء۔۱۱۸۶ء) میں لاہور ہندوستان میں فارسی زبان کے ابتدائی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پھر غوری سلاطین کا دور آیا جس کی اہم خصوصیت صوفیہ و مشائخ کا ہندوستان میں ورود ہے خواجہ معین الدین چشتی اسی زمانے (۱۱۶۱ء) میں ایران سے ہندوستان آئے۔ دہلی ہندوستان کا سیاسی مرکز مملوک بادشاہوں کے زمانے میں بنی۔ دورِ آخر کے مملوک بادشاہوں اور خلجی و تغلق حکمرانوں کا دور ہندوستان میں فارسی ادب کا زریں دور ہے۔[۹]

یہ امیر خسرو کا عہد ہے جب دہلی کے فارسی گویوں میں امیر خسرو، خواجہ حسن دہلوی، صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجا، مولانا عارف عبدالحکیم اور شہاب الدین وغیرہ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں اور شبلی نے شعر العجم میں ان کی اور علاء الدین خلجی کے دربار کے علما و فضلا کی لمبی فہرست تیار کی ہے اور لکھا ہے کہ "امیر خسرو کے آفتابِ کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔"[۱۰]

امیر خسرو ہندوستانی فارسی گویوں میں سب سے زیادہ با اثر سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں ہندوستان ہی نہیں ایران کے باکمالوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ فارسی ادب تین سبکوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور خسرو کی شخصیت اتنی ہمہ گیر تھی کہ ان کے بارے میں بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان کے "یہاں سبکِ خراسانی کا انحطاط، سبکِ عراقی کا شباب اور سبکِ ہندی کا آغاز دکھائی دیتا ہے۔"[۱۱]

ہماری فارسی اور اردو شعریات کی تشکیل میں ان کا رول نہایت اہم ہے۔اس کی تفصیل کے لیے میرا مضمون 'امیر خسرو اور اردو شعریات'، قاضی جمال حسین کا مضمون 'دیباچۂ غرۃ الکمال کی معنویت' اور دیباچۂ غرۃ الکمال (ترجمہ لطیف اللہ) پر شمس الرحمٰن فاروقی کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔خسرو نے دیباچۂ غرۃ الکمال میں لکھا ہے۔

''وہ صاحب انشا جس نے ہندوستان کے شہروں خصوصاً دہلی میں نشو ونما پائی ہے، اہل انشا کی مستقل ہم نشینی کے بغیر، ہر طریقے پر جو اہل انشا بولتے ہیں بات کہہ سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے اور نظم ونثر میں تصرف کرسکتا ہے۔''[12]

گویا خسرو کی نظر میں ہندستانی فارسی گو ایرانی فارسی گویوں کی سند کے محتاج نہیں ہیں اور فارسی پر ان کی حاکمانہ قدرت اس حد تک مسلم ہے کہ وہ فارسی میں تصرف کا بھی حق رکھتے ہیں۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ''ہندوستان میں کلام فارسی، ساحل سندھ سے بحر محیط کے دہانے تک یکساں ہے''۔[13] یعنی فارسی کا معیاری لہجہ جو متعین ہو چکا ہے اس کا بالعموم ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پاس رکھا جاتا ہے۔یعنی تمام ہندوستان کے فارسی گو اس سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور وہ اس زبان میں تصرف کا بھی حق رکھتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ایران کے ہر خطے کی فارسی کو مستند نہیں سمجھتے۔وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک اس فارسی کا تعلق ہے جو اہل زبان کے واسطے سے (یہاں) پہنچی ہے، سوائے ماوراءالنہر کی فارسی کے جو ہندوستان کی فارسی کے موافق ہے، کسی اور خطے کی (فارسی) عبارت درست نہیں ہے''۔[14]

اس میں دو اہم نکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ خسرو کی نظر میں ایران میں صرف ماوراءالنہر کی فارسی مستند ہے، دوسرے یہ کہ اس عہد میں ہمارے فارسی گویوں کا اعتماد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہندستانی فارسی کو ماوراءالنہر کی فارسی کے موافق کہنے کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ ماوراءالنہر کی فارسی ہندوستان کی فارسی کے موافق ہے۔یعنی ہم ہندوستانی فارسی کی سند ماوراءالنہر کی فارسی سے نہیں لیتے بلکہ ماوراءالنہر کی فارسی کو اسلئے مستند کہتے ہیں کہ وہ ہماری فارسی کے موافق ہے۔اور اس اعتماد کی فضا ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں میں بہت بعد تک ملتی ہے۔جس کا اندازہ خان آرزو کی ''تنبیہہ الغافلین'' اور ''احقاق الحق'' جیسی کتابوں سے ہوتا ہے۔تنبیہہ الغافلین ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۷ء میں مکمل ہوئی جس میں خان آرزو نے نہ صرف یہ کہ حزیں کی رکیک ہجوؤں کا انتقام لیا جو حزیں نے ہندستان اور ہندستانیوں کے لیے لکھی تھیں بلکہ حزیں کی فارسی دانی پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا[15] اور ان کے یہاں فارسی زبان سے متعلق بے شمار غلطیوں کی نشاندہی بھی کی۔گویا کہ اس زمانے میں ہندستانی فارسی گویوں کے لیے کسی کی فارسی صرف اس لیے مستند ٹھہرے کہ وہ ایک ایرانی نے لکھی ہے، ایسا نہیں تھا۔

حزیں نے تمام ہندستانی فارسی گو بشمول ابوالفضل، فیضی، ناصر علی سرہندی اور بیدل پر انتہائی حقارت آمیز تبصرے کیے تھے۔''وہ ہندوستانیوں کے بارے میں یہ بھی کہتے تھے کہ یہاں پنج وقتہ نماز کی تعداد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تو پھر علمی حقائق اور حکمت کے دقایق کا تو کہنا ہی کیا۔''[16]

خان آرزو نے حزیں کے اس متکبرانہ رویے کی گرفت کی اور ''تنبیہہ الغافلین'' میں خود حزیں کے کلام کی کوتاہیوں پر بھی

روشنی ڈالی ۔اس میں شک نہیں کہ خان آرزو کے جواب میں بہت شدت تھی اور انھوں نے حزیں کی کچھ بیجا گرفت بھی کی ہے لیکن ان کے کچھ اعتراضات بالکل درست اور اتنے عالمانہ ہیں کہ ان کو حزیں کے دوست اور ہم وطن والہ داغستانی نے بھی سراہا ہے[17] اور کچھ کی تائید صہبائی نے بھی 'قولِ فیصل' میں کی ہے جب کہ قولِ فیصل حزیں کی حمایت میں لکھی گئی تھی ۔[18] خان آرزو کے بعد میر محمد عظیم ثبات نے بھی اپنے والد میر محمد افضل ثابت کے کلام پر حزیں کے اعتراضات کا بدلہ لیا اور حزیں کے تقریباً ۱۵۰۰ اشعار کی نشاندہی کی ،جن کے مضامین متقدمین شعرا سے ماخوذ تھے اور یہ اتنی عمدہ کوشش ہے کہ والہ داغستانی نے 'ریاض الشعرا' میں لکھا ہے کہ ''اس طرح ثبات نے حزیں کے پانچ سو اشعار کو ضائع کر دیا ہے ۔''[19]

اسی طرح فاخر مکیں کی نخوت کا جواب میرزا محمد رفیع سودا (وفات ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) نے دیا۔ سوداؔ نے فاخر مکیں کے اعتراضات اور اصلاحات (جو اشرت علی خاں کی بیاض پر تھے) کی تردید 'عبرت الغافلین' کے نام سے لکھی جس میں خود فاخر مکیں کے کلام پر بھی گرفت کی گئی ہے ۔[20] اس سے صاف ظاہر ہے کہ اٹھارھویں صدی تک ہمارے فارسی اور اردو گویوں میں اتنا اعتماد تھا کہ خود فارسی کے سلسلے میں وہ ایرانیوں سے برابری کی سطح پر معاملہ کرنا جانتے تھے اور ایرانیوں کی برتری کے قائل نہیں تھے ۔اس کے برعکس ہمارے غالب جو یہ کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں (۱۸۲۱ء کے بعد)

وہ فارسی کے معاملے میں ایرانیوں کی برتری کو پوری طرح تسلیم کر لیتے ہیں ۔انھوں نے ۱۸۴۷ء یا اس سے کچھ قبل کے ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھا:

''لفظ 'بے بیز' تو رافی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے ۔ جب میں اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعرِ فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا ؟
مرزا جلال اسیر علیہ الرحمتہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے ۔میری کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں ،لیکن تعجب اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے ۔
''شست بستن'' جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے ۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرے میں ان کے پیرو ہیں ۔ ''بے بیز'' ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ۔ ورنہ صاحب زباں ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں''۔[21]

اس خط میں ایرانیوں کی انگلی پکڑ کر چلنے کا غالب کا رویہ اپنے شباب پر ہے ۔اس میں غالب واضح لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ جس فارسی لفظ یا ترکیب کی سند اہلِ ایران سے نہیں ملتی اس کا استعمال نہ صرف فارسی بلکہ اردو میں بھی ان کے نزدیک جائز نہیں ہے ۔غالب کا یہ عقیدہ ہے کہ:

''جو لوگ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم ونثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟''[22]

تفتہ کو ہی اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں چند الفاظ کے محل استعمال کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مگر قتیل اور واقف اور پورب کے ملکیوں کی فارسی'' [۲۳]

غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فارسی میں یہ الفاظ ان معنوں میں مستعمل نہیں ہیں۔ قتیل اور واقف اور پورب کے ملکیوں کی فارسی میں ہو سکتے ہیں، تو ان کا استعمال سند نہیں۔

صاحب عالم مارہروی کو اپریل ۱۸۵۹ء کو ایک خط لکھا ہے جس میں عبدالواسع ہانسوی اور قتیل اور غیاث الدین کو جلی کٹی سناتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا....

واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔'' [۲۴]

وہ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس زبان (فارسی) کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں: ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔'' [۲۵]

اسی خط میں 'جو اگست ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہے، یہ بھی لکھتے ہیں

''مگر جب کہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا تو میں نے مانا'' [۲۶]

اور اسی خط میں یہ بھی لکھتے ہیں

''سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں۔ وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھا گھس، الو عبدالواسع ہانسوی لفظ 'نامراد' کو غلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا قتیل 'صفوت کدہ وشفقت کدہ' 'ونشتر کدہ' کو اور 'ہمہ عالم' 'وہ 'ہمہ جا' کو غلط کہتا ہے۔''

اور ہندیوں کے قیاس سے غالبؔ کو بیر ہے۔ وہ عبدالغفور سرور کو ایک خط میں فخریہ انداز میں بتاتے ہیں کہ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ حالاں کہ سیالکوٹی مل وارستہ بھی ہندستانی تھا اس لیے غالب کو یہ بھی لکھنا پڑا کہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ [۲۷] لیکن وہ سیالکوٹی مل وارستہ کی 'رجم الشیاطین' سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ وہ ایک ایرانی فارسی داں کی حمایت اور ہندستانی فارسی داں کی مخالفت کے لیے لکھی گئی ہے۔ حالاں کہ اسی سیالکوٹی مل وارستہ کا حشر غالبؔ کے اس خط میں دیکھیے۔ وہ کلب علی خاں بہار کو ایک خط میں ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:

''میاں! انجو جامعِ فرہنگ جہاں گیری، شیخ رشید راقمِ فرہنگ رشیدی عظمائے عجم میں سے نہیں، ہند ان کا مولد، مآخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا، ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!''۔ [۲۸]

ہندیوں میں صرف ایک غالب ہیں جنھیں غالب کے خیال میں ''اس امر خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔'' [۲۹]
کیوں کہ ان کے بقول اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ وارد ہندستان ہوا اور اکبر آباد میں غالب کے مکان پر دو برس رہا اور انھوں نے اس سے ''حقائق و دقائقِ زبانِ پارسی'' کے معلوم کیے۔ [۳۰]

حالاں کہ قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ اس بزرگ یعنی ملا عبدالصمد کا وجود فرضی محض ہے۔ وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے، میری طرف سے جواب ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے... زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں مگر یہ کون کہے گا کہ یہ لوگ دعویِ زبان دانی کے باب ہیں۔ [۳۱]

مگر اس بات کو دوسرے ایران پرست فارسی اور اردو والے کہاں تسلیم کریں گے۔ اگر ان کا یہ جواب تسلیم کر لیا جاتا تو شبلی لفظ 'انداز' کے لیے غالب کی سند کو یہ کہہ کر رد نہیں کرتے کہ وہ اہلِ زبان نہیں ہیں [۳۲]۔ گویا کہ غالب سے جس طور کا آغاز ہوا اس کا سب سے زیادہ نقصان بھی غالب ہی کو پہنچا۔ غالب کے صرف ایک خط میں ایک ایرانی فارسی گو کے کلام میں ایک 'ہنوز' کو زائد اور بیہودہ کہا گیا ہے۔ یہ خط دسمبر ۱۸۵۲ء میں تفتہ کو لکھا گیا جس میں غالب لکھتے ہیں کہ:

''حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک 'ہنوز' زائد اور بیہودہ ہے، متتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو آدمی تھا؛ یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔'' [۳۳]

اس خط میں غالب کے ہاں وہ اعتماد نظر آتا ہے کہ غلطی چاہے ہندوستانی کی ہو یا ایرانی کی، بہر حال غلطی ہے اور اس کی گرفت کرنی چاہیے۔ لیکن حزیں چوں کہ ہندوستان آ گئے تھے اس لحاظ سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب ایک ایرانی استاد کی نہیں بلکہ اس ایرانی استاد کی مذمت کر رہے ہوں جس کو ہندستان کی آب و ہوا نے بگاڑا۔ کیوں کہ فیضی کے سلسلے میں ان کا کم و بیش رویہ ایسا ہی تھا۔ وہ تفتہ کو ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت استاد نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، ہم اس کو مانیں، ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں۔'' [۳۴]

اس میں فیضی کی زبان پر غالب نے جو اعتراض کیا ہے وہ اسی لیے ہندوستان آئے اور ہند میں آنے کے بعد ان کی زبان غالب کے لیے اس قدر محترم نہیں رہ جاتی جیسی ایرانیوں کی ہے۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ حزیں کی گرفت کی جرأت بھی غالب اس لیے کر سکے کیوں کہ وہ ایران کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ رہا امیر خسرو کو مسلم الثبوت ماننے کا معاملہ تو اس بارے میں خلیق انجم کی رائے یہ کہ

غالبؔ نے معرکۂ کلکتہ (جون یا جولائی ۱۸۲۸ء) کے بعد تمام ہندوستانی فارسی گویوں کو غیر مستند کہنا شروع کر دیا[۳۵] حالاں کہ اس سے پہلے ان کی کسی تحریر میں کسی ہندستانی فارسی گو یا فرہنگ نویس کے خلاف ایک لفظ نہیں ملتا اور عبدالقادر بیدل کا تو وہ تتبع ہی کرتے تھے اور فخریہ اس کا اقرار بھی کرتے تھے مگر اس معرکے نے ان کو بیدلؔ سے کنارہ کشی کی طرف مائل کر دیا اور انھوں نے تفتہ کے نام اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں "یہ فارسی بیدلانہ ہے۔"[۳۶] کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ جب کہ وہ ابتدائے فکرِ سخن یعنی تقریباً ۱۸۱۲ء میں یہ شعر کہہ چکے تھے۔

طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے[۳۷]

اور ۱۸۱۶ء کی دو غزلوں کے مقطعے یہ ہیں۔[۳۸]

اسد، ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا
مجھے راہ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے، خامہ بیدلؔ کا

۱۸۲۸ء تک غالبؔ بیدل کے اس حد تک قائل تھے کہ اپنی مثنوی 'بادِ مخالف' میں بھی بیدلؔ کی تعریف کی اور انھیں ان ہندستانی فارسی گویوں سے ممیز رکھا، جن کی تحریر و تقریر پر غالب کو بھروسا نہ تھا۔ اور وہ خسرو کے بھی قائل تھے مگر معرکۂ کلکتہ نے غالب کو تمام ہندستانی فارسی گویوں کے ساتھ خسرو اور بیدل سے بھی منحرف کر دیا۔ اور اس معرکے کے بعد ایک [دو] خط اور ایک شعر میں خسرو کی جو تعریف کی ہے وہ صرف اپنے بچاؤ کے لیے۔[۳۹] تا کہ ان کے بارے میں یہ نہ کہا جا سکے کہ وہ ایک بھی ہندستانی فارسی گو کے قائل نہیں ہیں۔ بیدلؔ سے انھوں نے اپنی مکمل برأت کا اظہار ۱۸۵۹ء میں کیا، جب عبدالغفور سرور کو یہ لکھا:

"ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ منت اور یقین اور واقف اور قتیل یہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے۔"[۴۰]

ناصر علی اور بیدل کو جس طرح ایک ہی سانس میں شبلی رد کرتے ہیں اس سے فوراً غالب کا یہ خط یاد آ جاتا ہے اور اگرچہ شعرالعجم ہی میں شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری میں:

"ہندوستان کے اختلاط نے لطافتِ خیال پیدا کی، اور یہی وجہ ہے جو ایرانی شعرا ہندوستانی بن گئے ان کے کلام کی لطافت خالص ایرانی شعرا کے کلام میں مطلق نہیں پائی جاتی۔ نظیری، طالب آملی، کلیم ایران میں کہاں مل سکتے ہیں۔"[۴۱]

لیکن انھوں نے شعرالعجم میں ہندستانی فارسی گویوں کو جتنی عزت دی ہے اور جن شرطوں پر دی ہے اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے سلسلے میں شبلی کا ذہن غالبؔ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، خصوصاً ناصر علی اور بیدل کے معاملے میں تو شبلی

باضابطہ غالب کے تربیت یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔

گویا کہ غالب نے ردِعمل کے طور پر جو رویہ اختیار کیا وہ شبلی اور نظم طبا طبائی تک آتے آتے ہمارے طرزِ احساس کا حصہ بن گیا اور یہ بالعموم تسلیم کرلیا گیا کہ کوئی بھی ہندستانی اہلِ ایران کی ہمسری نہیں کرسکتا اور فارسی میں تصرف تو بڑی بات ہے، کسی فارسی لفظ کو اردو میں بھی کسی ایرانی استاد کی انگلی پکڑ کے ہی استعمال کرسکتا ہے جس کی عبرت ناک مثال نظم طبا طبائی کا غالب کے اس مصرعے پر اعتراض ہے۔

سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

ان کا خیال ہے کہ سوا (فارسی) کو بکسرۂ اضافی اس کے (ہندی/اردو) کی طرف مضاف کرنا غلط ہے۔حالاں کہ "سوائے اس کے" اب اردو روزمرہ میں داخل ہے۔کوئی لفظ یا ترکیب غالب کے استعمال کے بعد قبول عام کی سند تو پا جائے لیکن قواعد دانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ٹھہرے۔یہ نتیجہ ہے اسی منطق کا جس کا سہارا پہلے پہل خود غالب نے اپنے بچاؤ کے لیے لیا تھا۔اس سے بڑی غالب کی ستم ظریفی اور کیا ہوگی۔شبلی اور نظم طبا طبائی کو غالب یہ سبق تو پڑھا سکتے تھے کہ فارسی ایران والوں کی زبان ہے اور اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا۔مگر یہ کیسے باور کرواسکتے ہیں کہ غالب بھی ایرانی ہیں؟ نظم طبا طبائی نے اسی مضمون میں 'غم ناک' سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

> "اگر کوئی کہے کہ بیدل اور فیضی جو کچھ کہہ جائیں وہ غلط نہیں ہوسکتا، اہلِ فن اس کو نہیں مانیں گے۔ان دونوں کی زبان فارسی تھی، متتبعین میں تھے، اہل زبان کبھی چشمِ نم نہیں کہتے، جب کہیں گے نم چشم کہیں گے۔"[۴۲]

اس سے ظاہر ہے کہ خسرو، خان آرزو، سوداؔ، آزاد بلگرامی، سید سلیمان ندوی اور عبدالستار صدیقی جیسے علماء نے ہندستانی فارسی اور اردو گویوں کے حقوق کی بحالی کے لیے اگرچہ بہت اور عمدہ کوششیں کیں لیکن جیت غالب، صہبائی، شبلی، نظم طبا طبائی، نیاز فتح پوری اور شوق نیموی جیسے ایران پرستوں کے رویے کی ہوئی اور اس طرح ہندستانی فارسی گویوں کا وقار تو کھویا ہی، اردو کو بھی اسی حد تک قابلِ قبول ٹھہرے جہاں تک ان کی تحریر و تقریر ایرانی فارسی گویوں کے مطابق سمجھی گئی۔اس طرح کی درجنوں مثالیں شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون 'ایرانی فارسی، ہندستانی، فارسی اور اردو مراتب کا قصہ" میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔حالاں کہ فاروقی نے دیباچۂ غرۃ الکمال کے مقدمے میں اس بحث کو غلط رخ پر ڈال دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

> "فارسی کی حد تک خسرو کو بھی یہ مسئلہ طے کرنا تھا کہ کیا ہندی الاصل شخص کو لسان پارسی میں استادی کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے؟ خسرو کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ بھی موج زن تھا....لہٰذا انھیں اس معاملے کا تصفیہ کرنے میں کچھ مشکل نہ ہوئی۔"[۴۳]

خسرو کے اس بیان کو کہ 'سواد ہند بالخصوص دہلی کے شعرا تمام عالم کے نیک طبعوں سے بہتر ہیں، جب الوطنی کے جذبے سے جوڑنا بنیادی طور پر ویسی ہی بے ایمانی ہے جیسی بے ایمانی ایران کے فارسی گویوں نے ہندستانی فارسی گویوں کو ساقط الاعتبار ٹھہرا

کر کی ہے۔اور کوئی انتہائی متعصب ایرانی بھی شاید خسرو کے ساتھ اس سے برا سلوک نہیں کرسکتا۔

حواشی

۱۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم حصہ دوم، ۲۰۰۴، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۳۷

۲۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم حصہ پنجم، ۲۰۰۲، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۶۴

۳۔ ایضاً، ص ص۔۲۳۔۲۴

۴۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص۔۵۱

۵۔ شبلی نعمانی، املا اور صحت الفاظ، مقالات شبلی جلد دوم، ۲۰۰۸، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۵۹

۶۔ ایضاً، ص۔۶۰

۷۔ ایضاً، ص۔۶۰

۸۔ ایضاً، ص۔۶۰

۹۔ امیر حسن عابدی، فارسی زبان و ادب کی ترویج و توسیع میں ہندوستان کا حصہ، ہندستانی فارسی ادب، ۱۹۸۴، دہلی: انڈو پرشین سوسائٹی، ص ص۔۳۔۱

۱۰۔ شبلی، شعرالعجم، حصہ دوم، ۲۰۰۴، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۸۲

۱۱۔ امیر حسن عابدی، امیر خسرو اور سبک ہندی، خسرو شناسی، ۱۹۸۹ء، دہلی: ترقی اردو بیورو، ص۔۱۹۹

۱۲۔ امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ، ۱۴۲۵ھ، کراچی: شہرزاد، ص۔۷۸

۱۳۔ ایضاً، ص۔۷۹

۱۴۔ ایضاً، ص۔۷۸

۱۵۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص۵۰

۱۶۔ شریف حسین قاسمی، فارسی میں ادبی تنقید کی روایت اور تنبیہ الغافلین، سراج الدین علی خاں آرزو ایک مطالعہ، ۲۰۰۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۷۶

۱۷۔ ایضاً، ص۔۷۷

۱۸۔ ایضاً، ص۔۸۳

۱۹۔ ایضاً، ص۔۷۸

۲۰۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص۔۵۱

۲۱۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد اول، ۱۹۸۴ء، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۲۳۴

۲۲۔ ایضاً، ص۔۲۳۷

۲۳۔ ایضاً، ص۔۴۸۶

۲۴۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد سوم، ۱۹۸۷، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۱۰۱۹

۲۵۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد اول، ۱۹۸۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۳۳۵

۲۶۔ ایضاً، ص۔۳۳۵

۲۷۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد دوم، ۱۹۸۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۵۹۴۔۵۹۵
۲۸۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد سوم، ۱۹۸۷، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۱۲۳۴
۲۹۔ ایضاً، ص ۔۱۲۳۴
۳۰۔ ایضاً، ص ۔۱۲۳۴
۳۱۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ۲۰۰۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۳۰۲
۳۲۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص ۔۵۱
۳۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد اول، ۱۹۸۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۲۵۰
۳۴۔ ایضاً، ص ۔۳۵۲
۳۵۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ۲۰۰۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۲۰۶
۳۶۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد اول، ۱۹۸۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۳۳۷
۳۷۔ کالی داس گپتا رضا، دیوان غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے، ۱۹۸۸، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ، ص ۔۱۰۹
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۲۰۔۱۱۳
۳۹۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ۲۰۰۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۳۶۵
۴۰۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد دوم، ۱۹۸۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۔۵۹۴
۴۱۔ شبلی نعمانی، شعر العجم جلد ۵، ۲۰۰۲، اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، ص ۔۶۸
۴۲۔ نظم طباطبائی، ادب الکاتب والشاعر، مقالات طباطبائی، ۱۹۸۴، حیدر آباد: الیاس ٹریڈرس، ص ۔۲۰۶
۴۳۔ شمس الرحمن فاروقی، مقدمہ دیباچہ غرۃ الکمال (ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ) ۱۴۲۵ھ، کراچی: شہرزاد، ص ۔۱۷

صرف پاکستانی کہلائے جانے پر فخر کیجیے

"بلوچستان آزاد اور بہادر انسانوں کی سرزمین ہے۔ اس لیے آپ کی نظروں میں قومی آزادی عزت اور طاقت کے الفاظ کی خاص قدر و قیمت ہونی چاہیے۔ یہ "ملکی" اور غیر ملکی کی باتیں نہ ملک کے لیے مفید ہیں نہ آپ کے شایانِ شان ہیں۔ اب تو ہم سب پاکستانی ہیں، ہم نہ بلوچی ہیں نہ پٹھان ہیں نہ سندھی ہیں، نہ بنگالی نہ پنجابی، ہمارے احساسات اور طرزِ عمل بھی پاکستانیوں جیسے ہونے چاہئیں اور ہمیں چاہیے کہ بجائے کسی اور نام کے صرف پاکستانی کہلائے جانے پر فخر محسوس کریں۔"

(خطبات قائد اعظم، رئیس جعفری، ص ۵۹۱)

اقبال کی تاریخی تلمیحات

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

تلمیح یا چشمول[1] جسے تملیح بھی کہا گیا[2] عربی مادے "لـمـح" سے مشتق ہے۔ لغوی سطح پر اس سے مراد اشارہ کرنا یا دیکھنا[3] کسی چیز پر نگاہ سبک ڈالنا[4] کم نگاہی سے دیکھنا، سرسری یا ہلکی نگاہ[5] گوشۂ چشم سے کسی چیز کو تکنا یا اس پر نگاہ ڈالنا[6] آنکھ کے کنارے یا سرے سے اشارہ کرنا[7] کسی امر کا بالواسطہ، ناراست، ٹیڑھا اور مخفی تذکرہ، سرسری و اچٹتی نگاہ، معمولی سی جھلک، پرتو، لشکارا یا جھپکی[8] استصواب رائے کرنا، سراغ رسانی کرنا، کھوج لگانا، آشکار کرنا یا کھولنا[9] ہے اور اس کا زیادہ تر تعلق نگاہ و نظر یا خیال و تصور سے بیان کیا جاتا ہے۔[10]

علم بدیع کی اصطلاح میں تلمیح اس شاعرانہ حربے کو کہتے ہیں جس کے تحت کہنے والا یا لکھنے والا اپنے کلام یا تحریر میں کم سے کم الفاظ میں کسی قصے، آیت، حدیث، شخصیت یا مشہور واقعے کی طرف اشارہ کرے[11] کسی قصہ طلب واقعے سے مضمون پیدا کرے[12] کسی ایسی چیز کا ذکر کرے جو کتب مستعملہ میں مذکور ہو[13] مشہور شعر یا ضرب المثل یا کسی مسئلے کو کلام میں لائے جیسے مقررین اہم واقعات کی طرف بسا اوقات جملوں اور لفظوں میں اشارہ کرتے ہیں[14] بعض علوم کی علمی و فنی اصطلاحات کو طرز بیان کا حصہ بنائے[15] مثلاً نجوم، ریاضی، موسیقی، طبیعی علوم وغیرہ کی اصطلاحیں اپنے کلام میں لائے[16] کسی تعبیر کی طرف اشارہ کرے یا فرہنگ عامہ، عقاید و آداب و رسوم و علوم قدیم کا تذکرہ[17] ایسے انداز میں کرے جس سے اس کے کلام کی معنویت میں اضافہ ہو پائے۔ اس ایک اشارے کی ادائی سے نہ صرف وہ شخص، چیز یا واقعہ وغیرہ یاد آ جائے اور بھرپور انداز سے کلام کی توضیح ہو بلکہ جب تک اس مختصر اشارے کی وضاحت نہ ہو، کلام شاعر کی بخوبی تفہیم بھی نہ ہو سکے۔ گویا تلمیح کا مقصد ان مختلف قبیل کے اشارات سے تقویت معنی میں اضافہ کرنا اور قارئین سے اپنی شاعری کا اثبات کرانا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں تلمیح کے اس مربوط، منظم اور کثیر الجہتی نظام فن کا جائزہ لیں تو ہمیں اس کی متنوع حیثیات دکھائی دیتی ہیں۔ اقبال اس شاعرانہ حربے کے تحت اپنی شاعری میں کم سے کم الفاظ میں ماضی و حال کی کسی فرضی یا حقیقی شخصیت، واقعے، قصے یا اسطورہ، آیت یا حدیث، ضرب المثل، مشہور شعر یا ادب پارے، علمی و فنی مسئلے یا اصطلاح، علم قدیم و جدید، علمی، سیاسی یا سماجی تحریک یا اپنی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی ایسی جامعیت سے کرتے ہیں کہ ان کا کلام صوری و معنوی حسن سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ علامہ کے ہاں کلاسیکی و جدید دونوں طرح کی تلمیحات موجود ہیں۔ وہ کلاسیکی تلمیحات کے زیر اثر روایتی تلمیحوں کو جدت معنوی عطا کرتے ہیں اور جدید تلمیحات کے تحت اپنی ذات، خانوادے، معاصر شخصیات، اعزہ و احبا کا تذکرہ اور مسائل جدیدہ کو پیرہن شعری میں سمیٹتے

ہیں۔بلاغت، ان کے اس نظامِ تلمیح کا وصف خاص ہے اور اسی کے سبب ان کی تلمیحوں میں بیک وقت تاریخ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور حالیہ واقعات و حوادث کے نقوش بھی بخوبی اجاگر ہو پاتے ہیں۔مزید براں اقبال کے وضع کردہ لفظی و معنوی اضافات و تصرفات اور ان کے ہاں بعض مرکزی تلمیحات (Central Allusions) کی موجودگی ان کے تلمیحاتی ذخیرے کو انفرادی شان عطا کرتی ہے۔

شعر اقبال میں متذکرہ تلمیحاتی نوعیتوں میں علامہ کی تاریخی واقعات و حوادث اور اشخاص و امکنہ پر مبنی صورت خصوصیت کے ساتھ لائق مطالعہ ہے۔اقبال کی تاریخی تلمیحوں کو بنیادی طور پر دو حصوں اسلامی اور غیر اسلامی تلمیحات میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔اسلامی تاریخی شخصیات میں اولاً تو وہ حضور ﷺ اور ان کی ذاتِ مبارکہ سے وابستہ اور بعض بعد کی اسلامی شخصیات کا تلمیحاً تذکرہ کرتے ہیں۔پھر علامہ تاریخ اسلام کے ان اشخاص کو اپنے کلام میں بطور تلمیح لاتے ہیں جن کا تعلق دنیا کے مختلف خطوں سے رہا اور جنھوں نے مختلف زمانوں میں اسلام کی سطوت و عظمت کے جھنڈے گاڑے، جب کہ غیر اسلامی تاریخ کی تلمیحات کے تحت اقبال نے قبل مسیح کے بعض اہم تاریخی کرداروں اور واقعات کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی دنیا کے مختلف ادوار تاریخ میں نمایاں نقوش ثبت کرنے والے اشخاص و وقائع کے اشارات کو تقویت معنی کے لیے پیوند شعر کیا ہے۔ذیل میں دونوں حوالوں سے اقبال کے انداز تلمیح پر روشنی ڈالی جاتی ہے:

(ا) اسلامی تاریخ کی تلمیحات

اسلامی تاریخ کی تلمیحات میں اقبال نے حضور ﷺ اور آپؐ سے وابستہ افراد کے علاوہ بعد کی اسلامی تاریخی شخصیات کو اپنے کلام کی معنویت میں اضافے کے لیے مستعار لیا ہے۔میرِ حجازؐ، محمد عربیؐ اور سالارِ کاروانِ ملت سے والہانہ لگاؤ کا اظہار ویسے تو کلام اقبال کے اوراق میں بار ہا ملتا ہے مگر خالصتاً تلمیح کے زاویے سے اقبال کے ہاں غزوات بدر و حنین سے متعلق تلمیحات کے ساتھ ساتھ (بہ مشتاقاں حدیث خواجہ بدر و حنین آور + تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکارا مد، ب د ۵۷۲) اور حضور ﷺ کی مکے سے مدینے کی جانب ہجرت کے واقعے کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی تائید کے لیے تلمیحاً موزوں کرنے کا رجحان ملتا ہے:

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(ب د، ص ۱۶۰)

خصوصاً علامہ، حضور ﷺ کے ساتھ ابولہب کی تلمیح لا کر دو متضاد مکاتیب فکر کی نشان دہی کرتے ہیں۔"مصطفویؐ" اور "بولہبی" ان کے کلام میں علامات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور وہ کفر و اسلام کی کشاکش پیش کرتے ہوئے ان علامتی تلمیحوں سے معنی اخذ کرتے ہیں، مثلاً:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی　　(ب د، ۲۲۳)

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب　　(ب ج، ۱۱۴)
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو　　وصال مصطفویؐ، افتراق بولہبی　　(ض ک، ۲۳)
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است　　(ا ح، ۴۹)

کلام اقبال میں شامل متذکرہ دیگر تلمیحی شخصیتوں میں حضرت فاطمتہ الزہراؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت عمرؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوزر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت عقبہؓ بن نافع شامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے ان میں سے کچھ تلمیحات بہت کم برتی ہیں مگر ان کی پیش کش میں کمال درجے کی پُرکاری ضرور نظر آتی ہے، مثلاً وہ حضرت عمرؓ کے دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اس کو استحکام دینے، حضرت عثمانؓ کے اسلام کے لیے بے پایاں دولت صرف کرنے، حضرت خالدؓ بن ولید کے ہر لحظہ جہاد کے لیے مستعد رہنے، حضرت ابوزر غفاریؓ کے فقر و درویشی اختیار کرنے اور حضرت فاطمہؓ کی عفت وعصمت کے تاریخی حوالوں کو پیش نظر رکھ کر "دل بیدار فاروقی"، "دولت عثمانی"، "خالد جانباز"، "فقر بوزر" اور "چادر زہرا" جیسی مؤثر تلمیحاتی تراکیب اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ "سلمان الخیر"، حضرت سلمان فارسیؓ کے صدق وصفا، فقر وغنا اور عشق رسولؐ اور حضور ﷺ کے نادیدہ عاشق، "خیر التابعین"، حضرت اویس قرنیؓ کے جذبۂ حب محمدؐ کو بڑی کامیابی سے اصلاح احوال کے لیے تلمیح کر دیتے ہیں:

عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا　　رسم سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا　　(ب د، ۱۶۸)

بعینہٖ شعر اقبال میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا تلمیحی حوالہ بھی موجود ہے اور وہ افریقا کے والی حضرت عقبہ بن نافع کے جذبہ جہاد کو بھی پرتاثیر اور بامعنی انداز میں پیوند کلام کرتے ہیں:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے　　(ب د، ۱۶۶)

تاہم ان مختصر مگر بلیغ اشارات کے علاوہ اقبال نے بعض تلمیحوں کا بہ تکرار استعمال کیا ہے اور ایک سطح پر یہ تلمیحیں علامہ کی خاص علامتوں اور کنایوں کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے متعلق تلمیحات قابل مطالعہ ہیں۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی تلمیحیں واقعاتی رنگ لیے ہوئے ہیں اور ان کی وساطت سے اقبال نے تاریخ اسلام کے دو اہم واقعات کو پیش کیا ہے۔ پہلا واقعہ "غزوہ تبوک" سے متعلق ہے، جس میں حضرت صدیق اکبر نے اپنا تمام مال ومتاع اسلام کی خاطر حضور ﷺ کے سامنے پیش کر کے اپنے لیے رفاقت رسول ﷺ کو کافی سمجھا۔ اس واقعاتی تلمیح میں علامہ کے ہاں تحسینی رجحان بھی ابھر کر سامنے آیا ہے اور عشقِ رسولؐ کی ایک نادر جھلک بھی مل جاتی ہے:

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر!　　اے تیری ذات باعث تکوینِ روزگار!
پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس　　صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس　　(ب د، ۲۲۴-۲۲۵)

جب کہ دوسرا واقعہ ''جنگ یرموک'' سے وابستہ ہے جس میں فاتح شام اور نامور سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ کی تلمیح پیش ہوئی ہے جنھوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور ان کا بے مثل کارنامہ رومی فرماں روا ہرقل کا مقابلہ کر کے فتح یاب ہونا ہے۔ اقبال اسی جنگ کے ایک واقعے کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں حضرت ابوعبیدہؓ کے لشکر کے ایک سیماب صفت فرزند نے لڑائی کی اجازت طلب کی تا کہ حضور کے عشق میں جان قربان کرنے کے اعزاز سے بہرہ مند ہو۔ اس نوجوان نے آپؓ سے کہا کہ میں رسول پاکؐ کی بارگاہ میں آپؐ کا کیا پیغام لے جاؤں تو آپؓ نے فرمایا کہ انھیں میرا اسلام کہنا اور بتانا کہ دین کی فتح و نصرت کے جو وعدے آپؐ نے فرمائے تھے، وہ سب پورے ہو رہے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ تلمیحی واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نظم میں سمٹ آیا ہے اور اقبال نے اس تمام تر فضا کو کامیابی سے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے، مذکور تلمیحی نظم کا آخری حصہ دیکھیے:

پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد — کتنا بلند تری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہ رسولؐ امیں میں تو — کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پہ کرم کیا ہے خدائے غیور نے — پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے (ب د، ۲۴۷)

کلام اقبال میں مؤذنِ رسولؐ حضرت بلالؓ کا تذکرہ سرتاسر عشق و عقیدت کی علامت کے طور پر آیا ہے اور اقبال نے آپؓ کے اس بے مثال جذبے کو مختلف اسلامی شخصیات، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت اویس قرنیؓ کی جذبۂ عشق پر مبنی تلمیحوں کے استمداد سے زیادہ صراحت سے پیش کر دیا ہے، جیسے لکھتے ہیں:

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری — شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثل کلیم سودا تھا — اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا — ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا (ب د، ۸۰۔۸۱)

''ابوالحسن''، حضرت علیؓ اسلامی تاریخ میں شجاعت و دلیری کا کنایہ ہیں اور اسی نسبت سے آپؓ کو ''حیدر کرار'' یا ''اسداللہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ آپؓ اپنے تنِ خاکی کو فقر و غنا سے تسخیر کرنے اور جہاد کے ذریعے سے اثباتِ حق کرنے کے سبب ''ابوتراب'' اور ''یداللہ'' بھی کہلاتے ہیں۔ آپؓ فاتح خیبر ہیں اور آپؓ کے ہاتھوں مرحب اور عنتر جیسے سرکش قتل ہوئے۔ اقبال کے کلام میں ''اسداللّٰہی و یداللّٰہی'' حق اور ''مرحبی و عنتری'' کفر و استبداد کی علامتیں ہیں اور وہ حضرت علیؓ سے متعلق ان مختلف تلمیحوں کو اسی تناظر میں پیش کر کے مسلمانوں میں حرکت و حرارتِ عمل پیدا کرتے ہیں، اقبال کا اندازِ تلمیح ملاحظہ ہو:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پہ ہے مدارِ قوتِ حیدری (ب د، ۲۵۲)
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے — وہی فطرت اسداللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری (ب د، ۲۵۳)
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن — اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے (ب ج، ۶۴)
یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے (ب ج، ۸۷)

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی　　کہ اس فقر میں ہے حیدری و کراری (ض ک،۱۷۱)

شعر اقبال میں نواسہ رسولؐ، خلف الرشید علیؓ، جگر گوشہ بتولؓ حضرت امام حسینؓ کی تلمیح صبر و استقامت اور ایمان و ایقان کے استعارے کے طور پر آئی ہے۔ آپؓ اہل کوفہ و شام کی خاطر یزید سے برسرِ پیکار رہوئے اور شہادت کا رتبہ پایا، اقبال اسی مقام شبیریؓ کو مومن کا شعار خاص قرار دیتے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیریؓ　　بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی (ب ج،۷۳)

قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں　　گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوے دجلہ و فرات (ب ج،۱۱۴)

اک فقر ہے شبیریؓ، اس فقر میں ہے میری　　میراث مسلمانی، سرمایہ شبیریؓ (ب ج،۱۶۰)

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ　　کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری (ا ح،۳۸)

بعض اوقات اقبال تاریخ اسلامی کے مختلف اشخاص کا تذکرہ ایک ہی شعر میں ایسے موثر طور پر کرتے ہیں کہ تلمیح کا حربہ زیادہ با معنی اور کارگر محسوس ہونے لگتا ہے، مثلاً:

حیدریؓ فقر ہے نے دولت عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے (ب د،۲۰۵)

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کے بیچ کھاتا ہے　　گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہرا (ب ج،۲۳)

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دل مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے (ب ج،۱۴۴)

یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے　　رہی نہ دولت سلمانؓ و سلیمانؑ (ض ک،۵۱)

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا، لیکن　　بنتی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و سلمانیؓ (ض ک،۱۷۹)

جہاں تک دنیا کے مختلف خطوں سے وابستہ اسلامی شخصیات کا تعلق ہے، اس ضمن میں اقبال کے ہاں عرب و عجم کے معروف حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ہندستان کے بعض اہم مسلم اشخاص کا تذکرہ بھی تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔ عرب و عجم کی تلمیحی شخصیتوں میں وہ طارق بن زیاد، عبدالرحمٰن اول، ہارون رشید، طغرل، معتمد، سلطان سنجر اور سلطان سلیم سے متعلق تاریخی واقعات و حوادث کو منفرد جہتیں عطا کرتے اور ان میں سے بیشتر کو عظمت و سطوت کے استعاروں کے طور پر برتتے نظر آتے ہیں مثلاً تلمیح میں ندرت پیدا کرتے ہوئے وہ کہیں اندلس کے میدانِ جنگ میں طارق بن زیاد کے جذبہ جہاد، اعتمادِ نفس اور شوق شہادت کو دعا کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی (ب ج،۱۰۵)

تو کہیں خاندان عباسیہ کے معروف حکمران ہارون رشید کی آخری نصیحت کو بطور تلمیح لا کر مسلمان کے تصور مرگ کو اجاگر کرتے ہیں:

پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت　　لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے (ب ج،۱۶۷)

اسی طرح وہ شاہ قرطبہ عبدالرحمٰن اول الداخل کے چند اشعار کو جو اس نے ہسپانیہ میں اپنے بوئے ہوئے کھجور کے پہلے درخت سے مخاطب ہو کر لکھے، اس طرح تلمیحاً ماخوذ کرتے ہیں کہ ایک طرف عبدالرحمٰن اول کی عباسیوں کے استبداد کے پیش نظر شام سے

اندلس کی طرف مہاجرت کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ان شعری احساسات کا انسلاک اسلام کے ماوراے حدود وثغور تصورِ وطنیت سے ہونے لگتا ہے۔

صبح غربت میں اور چمکا ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے (ب ج،۱۰۳)

اقبال ان تاریخی تلمیحوں میں سے بعض کی تمثیلی وعلامتی جہتیں بھی ابھارتے ہیں جیسے انھوں نے اشبیلیہ کے دورِ زوال کے حکمران المعتمد علی اللہ کی یوسف بن تاشفین کے ہاتھوں اسیری و بے بسی کا نقشہ اس مہارت سے جمایا ہے کہ تلمیح میں تمثیل کے عناصر ابھر آتے ہیں۔

خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی
جو مری تیغ دو دم تھی، اب مری زنجیر ہے شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی! (ب ج،۱۰۲)

اسی طرح علامہ کے کلام میں سلاجقۂ بزرگ کے اولین بادشاہ طغرل بیگ اور آخری سلجوقی حکمران سلطان سنجر کے ساتھ ساتھ سلطان سلیم عثمانی کی قوت وشوکت پر مبنی تلمیحات مسلم شکوہ کی علامت بن گئی ہیں:

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب (ب ج،۱۱۳)
خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر (ض ک،٦۷)

ہندوستان سے متعلق تاریخی تلمیحات کے سلسلے میں اقبال نے یہاں کی مسلم شخصیات قطب الدین ایبک، شیر شاہ سوری، جہانگیر، شاہ عالم ثانی، غلام قادر رہیلہ اور ٹیپو سلطان کے علاوہ باہر سے آنے والے بعض حکمرانوں محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، امیر تیمور اور نادر شاہ افشار کے ذکر سے معنویت پیدا کی ہے۔ مقامی مسلم شخصیات میں اقبال کے ہاں ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک کے معرکوں اور مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر کی سطوت کی جانب مختصر اشارے ملتے ہیں جب کہ شیر شاہ سوری کی قابلیت اور سیاسی بصیرت کو بھی وہ ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یہ نکتہ خوب کہا شیر شاہ سوری نے کہ امتیاز قبایل تمام تر خواری (ض ک،۱۷۷)

تاہم ان کی تفصیلی توجہ غلام قادر رہیلہ اور ٹیپو سلطان کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ غلام قادر رہیلہ کا ذکر واقعاتی انداز کی تلمیح میں ملتا ہے جس میں اقبال نے اسے شاہ عالم ثانی سے رہیلہ خواتین کی تذلیل کا انتقام لیتے یوں دکھایا ہے کہ دودمانِ تیموری کے زوال کا نقشا تار کر رکھ دیا ہے:

رہیلہ کس قدر ظالم، جفاجو، کینہ پرور تھا نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے

رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشم احمر سے

پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا　　کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
وہ مقصد تھا مرا اس سے، کوئی تیمور کی بیٹی　　مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر　　حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

(ب د، ۲۱۸۔۲۱۹)

والی میسور، ابوالفتح ٹیپو سلطان نے جس دلیری سے ہندوستان کو اغیار کے تسلط سے نجات دلاتے ہوئے شہادت کا مرتبہ پایا، اقبال اسے سراہتے ہوئے سلطان شہید کی وصیت موزوں کرتے ہیں جس کی وساطت سے تلمیح پیغامبری کا فریضہ انجام دینے لگتی ہے، لکھتے ہیں:

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیلؑ نے　　جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے　　شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول (ض ک، ۷۳)

ہندوستان میں وارد ہونے والے بیرونی حکمرانوں میں اقبال، فاتح سومنات و امیر سلطان محمود غزنوی کی جلالت و شوکت اور بت شکنی کے قایل نظر آتے ہیں، خصوصاً وہ اس تلمیح میں سلطان کے وفادار غلام ایاز کے ذکر سے علامتی رنگ ابھارتے ہیں۔ چناں چہ ان کی شاعری میں کہیں محمود، عظمت و سطوت اور ایاز، مجبوری و محکومی کی علامت بن جاتا ہے تو کہیں یہ دونوں عاشق و معشوق کے علائم کی صورت اپنی جھلک دکھاتے ہیں، بعینہٖ علامہ اپنے تصورِ خودی سے ان تلمیحوں کا رشتہ قائم کر کے معنی مفید کا حصول کرتے ہیں:

جادوے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز　　دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری (ب د، ۲۶۱)

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں　　بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات (ب ج ۱۱۴)

فروفالِ محمود سے درگزر　　خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر (ب ج، ۱۴۸)

حاصل اس کا شکوہِ محمود　　فطرت میں اگر نہ ہو ایازی (ض ک، ۸۹)

اس ضمن میں شہاب الدین غوری کا اشاراتی ذکر قطب الدین ایبک کے ساتھ ہوتا ہے:

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی ...... (ب د، ۴۷)

جب کہ تیمور اور نادر شاہ افشار کی جنگجویانہ سرشت کے پیشِ نظر، ان کی تلمیحات ظلم اور بربریت کے استعاروں کی شکل میں نمود کرتی ہیں:

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا　　اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز! (ب د، ۲۶)

نادر نے لوٹی دلی کی دولت اک ضربِ شمشیر، افسانہ کوتاہ! (ض ک،۱۶۶)

(ب) غیر اسلامی تاریخی تلمیحات:

کلام اقبال میں غیر اسلامی تاریخ کے پُرشکوہ حکمرانوں اور معروف شخصیات پر مبنی وہ تلمیحات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں جو قبل مسیح کے بعض اہم تاریخی کرداروں کے علاوہ دنیا کے مختلف خطوں کے ممتاز و ممیز اشخاص و وقائع سے متعارف کراتی ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں اقبال قدیم یونانی، ایرانی، رومی، چینی وترکستانی اور ہندوستانی فرماں رواؤں کے تذکرے سے اپنی شاعری کو موافق وموثر بناتے ہیں، وہاں انھوں نے یورپ سے متعلق بعض انقلابی شخصیات کو بھی بڑی مہارت سے اپنے شعری تجربے کا حصہ بنایا ہے۔چناں چہ شعرا قبال میں بیشتر مقامات پر علامہ اپنے اسلوب خاص سے غیر اسلامی دنیا کے ان متنوع تاریخی کرداروں کے قدرے روایتی، دھندلے اور پرانے خاکوں میں تازہ اور اچھوتے رنگ بھرتے نظر آتے ہیں۔

تاریخ غیر مسلم کے ان مشاہیر میں اقبال سرزمین یونان کے فاتح جلیل، شاگرد ارسطو، اسکندر اعظم یا اسکندر مقدونی (Alexandar the great) کی جلالت ومنزلت کو بطور تلمیح اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں، جس نے ایران میں دارا اور ہندوستان میں راجا پورس کو عبرت ناک شکست دی۔ وہ دنیاوی جاہ وحشمت پر مبنی اس کردار اور اس سے وابستہ ''آئینۂ سکندری'' کی تلمیح کو اپنے افادی نقطۂ نظر کے تابع کر کے نئے معنی پیدا کر دیتے ہیں جس سے بیشتر مقامات پر تلمیح، علامت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شان سکندری سے تمام ساماں ہے تیرے سینے میں، تُو بھی آئینہ ساز ہو جا

(ب د،۱۲۹)

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

(ب ج،۴۸)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی

(ب ج،۱۴۶)

ایرانی حکمرانوں میں علامہ دارا، جمشید، اردشیر بابکاں، نوشیروان عادل اور خسرو پرویز کی شان وشکوہ کی حامل تلمیحوں کو اپنے نقطۂ نظر کی ترسیل میں معاون ٹھہراتے ہیں۔وہ دارا (Darus III) کی قوت وشوکت کا رشتہ اپنے تصورات خودی وفقر سے جوڑ کر مسلمان کی قوتِ عمل کو مہمیز کرتے ہیں، جمشید کے ''جام جہاں نما'' کو شاہانہ تکلف کی علامت بنا کر متنوع انداز میں باندھتے ہیں، ایران میں ساسانی خاندان کے مؤسس جلیل اردشیر بابکاں کے سیاست ومذہب کی یکتائی کے تصور کو سراہتے ہیں، نوشیروان عادل (خسرو اول) ملقب بہ کسریٰ کے داد وانصاف کو عیش کی علامت بناتے ہیں اور ساسانی بادشاہ، پسر ہرمزد، خسرو پرویز (خسرو دوم) کو جاہ و جلال، طمطراق اور زر پرستی کا استعارہ بنا کر اپنے مطمح نظر کی ترسیل مؤثر انداز میں کرتے ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا!

(ا ح،۱۵)

جہاں بیں مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

(ب ج،۸۶)

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی　　کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(ب ج،۱۱۸)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق　　کبھی شاہ شہاں، نوشیرواں عشق

(ب ج،۸۷)

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی　　کیا ہے اس نے فقروں کو وارثِ پرویز

(ب ج،۱۶)

رومی حکمرانوں میں اقبال، جولیس سیزر کا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہیں جس نے عوام میں اپنی مقبولیت اور سطوت کے سبب بڑے کر وفر سے حکومت کی اور بعدازاں اٹلی میں مسولینی نے ''آل سیزر'' کو قیصریت یا سیزر کے اسی خواب کا احساس دلایا

توڑ اس کا رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ　　آل سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب (ا ح،۹)

اسی طرح بسا اوقات علامہ ایرانی و رومی، اکاسرہ و قیاصرہ کو شوکت و طنطنے کی علامتیں بنا کر بیک وقت تلمیح کر دیتے ہیں جس سے ان کے کلام کا علامتی رنگ تقویت پکڑتا ہے، جیسے:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوزرؓ، صدقِ سلمانیؓ

(ب د،۲۷۰)

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی　　وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

(ب ج،۲۳)

محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری　　محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

(ب د،۲۵)

چینی و ترکستانی خطوں کے اشخاص معروف کے ضمن میں اقبال فغفور و خاقان کے القاب سے معروف قدیم ترین حکمرانوں کا تلمیحی تذکرہ بھی کرتے ہیں اور انھیں بادشاہت اور استعماریت کے کنایے کے طور پر بھی برتتے ہیں۔ انھی خطوں سے وابستہ چینی تاتار کے علاقے منگولیا کے خانہ بدوش اور خوں خوار قوم کے خاقانِ اعظم، چنگیز خان کی جہانگیری و جہاں داری کا ذکر بھی کلامِ اقبال میں ملتا ہے جس نے اپنے وضع کردہ قوانین و ضوابطِ حکمرانی سے کل تاتار اور چین پر تسلط جمایا۔ علامہ کے ہاں اس نسبت سے چنگیزیت، ظلم و تعدی کی علامت بن گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تاتار سے موسوم تاریوں کے اس دودمان کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جس نے ایران پر حکمرانی کی اور ایلخان کہلایا اور جو بالآخر مسلمان ہوا۔ یوں عباسی سلطنت کو برباد کرنے والے چنگیز خان ہی کے خانوادے سے کعبے کی پاسبانی کرنے والے غیور مسلمان سامنے آئے۔ متذکرہ حوالوں کے ضمن میں اشعار دیکھیے:

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں

(ا ح، ۱۳۰)

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(ب ج، ۴۰)

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

(ب د، ۲۰۶)

ہندوستان کی تلمیحات کے سلسلے میں اقبال، پنجاب کے راجا پورس کی تلمیح فنائے اقتدار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں، جسے اسکندر رومی (اسکندر اعظم) نے ایران کے دارا کو شکست دینے کے بعد جہلم کے نزدیک زوال سے ہمکنار کیا، اس تاریخی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

تاریخ کہہ رہی ہے رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

(ب د، ۲۴۱)

جہاں تک یورپ کی انقلابی شخصیات کا تعلق ہے، ان میں علامہ امریکا کے دریافت کنندہ کرسٹوفر کولمبس، فرانس کے مدبر سیاس اور جلیل فاتح نپولین بونا پارٹ اور اطالوی محبِ وطن مازنی کو جوش کردار اور جہد مسلسل کے اعتبار سے برمحل تلمیح کرتے ہیں۔ اسی تناظر میں وہ انقلاب فرانس کو نگاہ ستائش سے دیکھتے ہیں جس سے ان کے اپنے انقلابی مزاج کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے، شعر دیکھیے:

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

(ب د، ۲۰۰)

راز ہے، راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز — جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

(ب ج، ۱۴۹)

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو! — جہاز پر سے تمھیں سلام کرتے ہیں

(ب د، ۱۳۹)

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

(ب ج، ۹۹)

اقبال کی اسلامی و غیر اسلامی تاریخ کی یہ تلمیحات تاثیر شعری سے بھرپور ہیں اور ان کے تاریخی مطالعے پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ شعرِ اقبال کو منفرد معنوی ابعاد عطا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ علامہ کی تاریخی تلمیحوں میں آغاز سے انجام تک حسن و خوبی کے عناصر موجود ہیں اور یہ تلمیحات صحیح معنوں میں ان کے اسلامی و غیر اسلامی تاریخی مطالعے کی آئینہ دار ہیں۔ ان تلمیحات سے اقبال کی وسعتِ علمی اور بلاغتِ شعری کا مؤثر اظہار ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ تاریخی تلمیحوں کا اطلاق حوادث نو پر کرتے ہیں تو ان کا

شعری اسلوب نکھر جاتا ہے اور تلمیح محض صنایع لفظی میں شامل ایک صنعت نہیں رہتی بلکہ ایک کامل فن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ کزازی، میر جلال الدین: بدیع (زیباشناسی سخن پارسی)، ص ۱۱۰
۲۔ حالاں کہ یہ درست نہیں کیوں کہ تلمیح سے مراد "افزودن نمک بہ طعام" ہے، دیکھیے: واژہ نامۂ ہنر شاعری از میمنت میر صادقی، ص ۸۳
۳۔ فرہنگ عمید، تہران: کتاب خانہ محمد حسن علمی ۱۳۴۳ھ، ص ۴۱۷
۴۔ فرہنگ آنندراج، تہران: موسسہ انتشارات امیر کبیر، ۱۹۸۴ء، ج ۲، ص ۱۱۸۶
۵۔ فیروز اللغات فارسی از مولوی فیروز الدین، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۵۲ء، ص ۲۶۱
۶۔ فرہنگ تلمیحات شعر معاصر از محمد حسین محمدی، تہران: نشر میترا، طبع اول ۱۳۷۴ھ، ص ۷
۷۔ فنون بلاغت و صناعات ادبی از جلال الدین ہمائی، تہران: انتشارات توس، طبع سوم، ۱۳۶۴ھ، ج ۲، ص ۳۲۸
۸۔ فرہنگ جامع (فارسی با انگلیسی) از سلیمان حییم، ج ۱، ص ۴۷۳
۹۔ فرہنگ تلمیحات از سیروس شمیسا، تہران: انتشارات فردوس، طبع چہارم ۱۳۷۳ھ، ص ۵
۱۰۔ لغت نامہ دہخدا از علی اکبر دہخدا از زیر نظر دکتر محمد معین، تہران: ۱۳۴۳ھ، شمارہ مسلسل ۱۰۲، شمارہ حرف "ت"، ۷، ص ۹۱۵
۱۱۔ لطف اللہ کریمی: اصطلاحات ادبی (انگلیسی۔ فارسی)، ص ۲۵، ۲۶
۱۲۔ میر صادقی: واژہ نامہ ہنر شاعری، ص ۸۳
۱۳۔ فقیر، شمس الدین: حدائق البلاغۃ (ترجمہ) امام بخش صہبائی لکھنو: مطبع نولکشور، س ن، ص ۱۰۲
۱۴۔ محمد عبید اللہ الاسعدی: تسہیل البلاغۃ، ص ۲۰۴۔ ۲۰۵
۱۵۔ فرہنگ صبا، ایران: انتشارات صبا، سال ۲۷، ص ۲۹۷
۱۶۔ فیروز اللغات فارسی، ص ۲۶۱
۱۷۔ دانش نامۂ ادب فارسی (۲)، ایران: آسیای مرکزی ۱۳۷۵ش، ج ۱، ص ۳۰۰

ادب اور پنجاب

ڈاکٹر سلیم اختر

تخلیقی طور سے پنجاب ہمیشہ ہی فعال رہا ہے، وجہ میرا پنجابی ہونا نہیں بلکہ اس خطے کا جغرافیائی محل وقوع اور اس سے جنم لینے والا تاریخی اور ثقافتی تناظر ہے۔

تمام حملہ آور بذریعہ درۂ خیبر جب ہندوستان میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے پنجاب ہی پہنچتے۔ جہاں تک آبادکاری کا تعلق ہے تو تمام ہندوستان میں سب سے پہلے پنجاب ہی آباد ہوا۔ مُنڈا قبائل، دراوڑ اور پھر آریہ بھی پہلے پہل پنجاب میں آباد ہوئے۔ یہیں وید یں مرتب ہوئیں اور یہیں اساطیری دریا سرسوتی تھا جو چولستان کے صحرا میں آسودۂ خاک ہوا۔ انتھروپولوجی کی جدید تحقیقات کے بہ موجب اولین انسان Homosapine کا ظہور بھی وادیِ سواں میں ہوا۔

ویدوں کی مذہبی حیثیت سے قطع نظر، یہ اس عہد کی تاریخ، زبان، طرزِ زیست، رسوم و رواج کے بارے میں مستند معلومات بھی فراہم کرتی ہیں۔ آج بھی ادبی جمالیات کی بنا پر "رگ وید" کے گیتوں سے حظ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک لسانی مطالعہ کا تعلق ہے تو آج بھی چھ ہزار برس قدیم مُنڈا زبان کے متعدد الفاظ ہماری عام بول چال کا حصہ ہیں جیسے "نانا، نانی، ماما، مامی، پھوپھا، پھوپھو، سالا، ممانی، موسی، بر (بمعنی دولھا) پیڑھی (بمعنی نسل) نتھ، گہنا، آنچل، دُھسا، توڑا، کوس، ببول، دھتورا، ککڑی، کریلا، نیم، پیتہ، آوا، بھٹی، پنڈا، آرا، ڈنڈا، برچھا، ڈھال، بوٹی، کھوجی، جھونپڑی، دالان، پھاٹک، بھاڑا، چیلا، چتر، ڈھال، ڈھارس، گیرو، لاگ، مت، مورکھ، منڈلی، ناتا، روڑا، اڑوس پڑوس، دھوم دھام، کھٹ پٹ۔" ("اردو زبان کی قدیم تاریخ"، از عین الحق فرید کوٹی، ص ۱۰۴)

یہ تمام الفاظ آج بھی پنجابی (اور اردو) میں استعمال ہو رہے ہیں، اشفاق احمد نے "اردو کے خوابیدہ الفاظ" کے نام سے جو دلچسپ مختصر لغت مرتب کی تھی، اس کے بیشتر الفاظ بھی پنجابی زبان کے ہیں۔ پنجابی اور اردو کا یہ تال میل قابلِ توجہ ہے، جس سے اس امر کی توضیح ہو جاتی ہے کہ زبانوں کی گنگا جمنا سے کیسے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ داخلی توانائی کی بنا پر لفظ کیسے زندہ رہتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے دیکھیں تو پٹھانوں، خلجیوں، تغلقوں اور مُغلوں سے کہیں پہلے سکندر یونان سے نکلتا ہے اور ایران کو زیر کرنے کے بعد پنجاب میں داخل ہوتا ہے اور یوں جہلم کے مقام پر وہ مشہور جنگ ہوتی ہے جس نے "پورس کے ہاتھی" جیسی ضرب المثل دی۔ اس کے بعد سکندر ملتان کا رخ کرتا ہے، جہاں ایک خوفناک جنگ میں خود بھی زخمی ہوا، ملتان ہی میں فوجوں نے مزید

آگے بڑھنے سے انکار کیا تھا۔

الغرض پنجاب ایک نوع کی تاریخی گزرگاہ بلکہ ایسی شارع عام بن جاتا ہے جو حملہ آور کو سیدھی دہلی لے جاتی، سلطنت دہلی میں قائم ہوتی مگر لاتعداد فوجی، تاجر، پیشہ ور پنجاب میں مستقلاً آباد ہو جاتے۔ بھانت بھانت کے لوگ اپنی بولیاں، مذہب اور کلچر ساتھ لے آئے اور اس خطے میں رچ بس گئے۔ یوں بتدریج اس امتزاجی عمل کا آغاز ہوا، جس نے پنجابی زبان اور کلچر کے خدوخال سنوارے اور جن کا نقطۂ عروج اردو کی تشکیل اور صورت پذیری کی صورت میں ہوا۔ جہاں اردو گئی، وہیں بالواسطہ طور پر پنجاب کی مٹی کی خوشبو بھی پہنچی، ہمیں دکنی شاعروں یا ہندوی میں پنجابی اور سرائیکی کے جو الفاظ مل جاتے ہیں تو وہ بھی اسی باعث ہے۔

امیر خسرو نے یقیناً یہ شعر ملتان میں کہا ہوگا:

من کہ بہ سر نمی نہادم گُل
بار بہ سر نہاد و گفتہ جھل

مختلف بولیوں اور ثقافتوں کے امتزاج نے بالآخر اس رویے کی تشکیل کی کہ پنجابی نہ تو طرزِ کہن پہ اڑتا ہے اور نہ ہی آئینِ نو سے ڈرتا ہے۔ اس لیے ادب اور شاعری میں پنجاب نے قائدانہ کردار ادا کیا، ہمیشہ سے اقبال، فیض، راشد، میرا جی، ندیم اور منٹو اسی خطہ ہی کی دین ہیں۔ سر سید احمد خان کی سارے ہندوستان نے مخالفت کی مگر اہلِ لاہور نے اس گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا کہ خوش ہو کر انھوں نے ''زندہ دلانِ پنجاب'' کے خطاب سے نوازا۔

۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی کے بعد تو دہلی، لکھنؤ اور دیگر شہروں کے بیکار، نادار افراد کے لیے پنجاب ایک طرح کا دبئی ثابت ہوا یوں محمد حسین آزاد کے مانند لاتعداد اہلِ قلم اور اہلِ ہنر کو یہاں عافیت ملی۔

۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو حکومت کے ایما پر ''انجمن پنجاب'' قائم کی گئی۔ دراصل یہ نظم نگاری کے ذریعہ سے اردو شاعری کو غزل کے تنگنایے سے نکال کر تخلیقی امکانات میں وسعت دینے کی ایک کوشش تھی۔

محمد حسین آزاد ''انجمن پنجاب'' کی روحِ رواں تھے۔ حالؔی بھی ان دنوں لاہور میں تھے انھوں نے بھی انجمن کے مشاعروں کے لیے نظمیں لکھیں۔ ماہانہ مشاعرہ میں مصرع طرح کے برعکس نظم لکھنے کے لیے عنوان (''حبِ وطن''، ''برسات''، ''امن'' وغیرہ) دیا جاتا تھا۔ دس مشاعروں کے بعد ملک گیر مخالفت کی بنا پر یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا لیکن ان مشاعروں نے نظم نگاری کا شوق پیدا کر دیا۔ یوں پنجاب میں غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری بھی فروغ پاتی رہی۔

شاعر، شعر اور مشاعرہ لازم و ملزوم ہیں چناں چہ لاہور میں بھی انیسویں صدی میں مشاعروں کا آغاز ہو جاتا ہے (تفصیلات کے لیے راقم کا مقالہ ''لاہور میں مشاعرے'' مجلّہ ''مخزن'' قائداعظم لائبریری شمارہ ۱۸، ۲۰۱۰ء ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)

اپریل ۱۹۰۱ء میں سر عبدالقادر نے لاہور سے ''مخزن'' کا اجرا کیا، اس کے پہلے شمارہ میں علامہ اقبال کی نظم ''ہمالہ'' شائع ہوئی۔ فکرِ نو کا داعی یہ رجحان ساز رسالہ تمام ہندوستان میں پنجاب کے تخلیقی تشخص کا باعث بنا۔ ''مخزن'' ادب میں فکرِ نو، تجربات اور جدید رجحانات کے فروغ کا باعث بنا اور جلد ہی تمام ہندوستان میں اس کی شہرت ہو گئی۔ ''مخزن'' کے بعد ''ہمایوں''، ''نیرنگِ خیال''،

''رومان''، ''شاہکار''، ''عالمگیر'' اور ''ادبی دنیا'' جیسے جرائد کا اجرا ہوا۔ ان سب نے نہ صرف یہ کہ پنجاب کے تخلیق کاروں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا بلکہ پنجاب میں بھی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے سازگار فضا پیدا کی۔

افکارِ نو قبول کرنے کی صلاحیت نے اس خطہ کے تخلیق کاروں کو وہ صلاحیت بخشی جس کی بنا پر یہاں نہ صرف تخلیقی اظہار و اسلوب میں تخلیقی تجربات ہوتے رہے بلکہ انھیں قبول بھی کیا جاتا رہا۔ اقبال، فیض، راشد، میراجی، ندیم، منٹو اس لیے بڑے تخلیق کار نہیں کہ یہ پنجابی تھے بلکہ اس پنجابی رویے کے باعث بڑے ہیں جو موضوع اور ہیئت کے نئے پن سے الرجک نہیں، اگر یہ نام حذف کر دیں تو اردو ادب میں بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے، اتنا بڑا کہ اردو ادب، اردو ادب نہیں رہتا۔ کم از کم وہ ادب تو نہیں رہتا جس سے ہم آپ آشنا ہیں۔

پنجاب کے تخلیق کاروں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو میں پنجابی الفاظ و محاورات شامل کرنے کے جس عمل کا آغاز کیا ہنوز بھی وہ جاری ہے۔ اشفاق احمد اور امجد اسلام امجد کے بعض ڈراموں کے ساتھ ظفر اقبال کی غزلیں معروف مثالیں ہیں۔

جب علامہ اقبال کی شاعری کا چرچا ہوا تو ایک طبقے نے ان کے پیغام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے زبان و بیان پر اعتراضات کیے۔ علامہ اقبال بالعموم معترضین کے خلاف ردِ عمل کا اظہار نہ کرتے تھے لیکن اردو میں پنجابی الفاظ و محاورات کے استعمال کے سلسلے میں انھوں نے لسانی دلائل کے ساتھ اپنے مؤقف کی وضاحت کی، غیر جذباتی اسلوب میں:

''.....اس بات پر مُصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان باہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو، اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ جو زبان ابھی بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدمِ صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے...... علم السنہ کا یہ ایک مسلّم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس عمل کو روک سکے۔''

(''مقالاتِ اقبال''، مرتبہ سیّد عبدالواحد معینی، ص ۴۰)

علامہ اقبال اس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

''تعجب ہے کہ میز، کمرا، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمہ کو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورہ کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُرمعنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باقی باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے، یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علمِ زبان کے اصولوں کے صریح خلاف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فردِ بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے

جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کیے جائیں تو آپ کا عذر بے جا ہوگا، اردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی الفاظ بدمعاش، بازار، لوٹ، چالان وغیرہ لے لیے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔''(ایضاً)

پنجابی ادیبوں اور علامہ اقبال پر اہلِ زبان جو اعتراضات کر رہے تھے وہ دراصل بند ذہن اور کھلے ذہن کے باعث تھے۔ زبان حرکی ہے (یا اسے ہونا چاہیے) زندہ زبان ہی زندہ خیالات کا ساتھ دے سکتی ہے۔ بہتا پانی صاف اور حیات بخش ہوتا ہے۔ پانی رک جائے تو گندہ جوہڑ بن جاتا ہے۔ تصوراتِ نو، نئی ایجادات اور نئی صورتِ حال کے لیے بعض اوقات مروّج الفاظ بے کار ثابت ہوتے ہیں تو نئے الفاظ، نئی علامات، نئی اصطلاحات اور نئی تشبیہات کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے دوسری زبانوں سے موزوں الفاظ و علامات حاصل کی جاتی ہیں۔ الفاظ زبان کے لیے آکسیجن کا کام کرتے ہیں، آکسیجن سے محروم مریض کا بچنا محال ہوتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں بڑے پتے کی بات کی:

''زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زبان انسانی جذبات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔''(''اقبال نامہ''، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، ص ۸۵)

بات ذرا پھیل گئی لیکن یہ اس امتزاجی عمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے جس کے باعث اب اردو میں پنجابی اور سرائیکی کے الفاظ کی شمولیت ہو رہی ہے۔

ایلیٹ نے کلاسیک کی یہ خصوصیت بتائی تھی کہ وہ اپنی زبان کے تمام تخلیقی امکانات کو اس خوش اسلوبی سے استعمال کرتا ہے کہ بعد میں آنے والے اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے، کچھ یہی عالم وارث شاہ کا بھی ہے جسے پنجابی زبان کا کلاسیک قرار دیا جا سکتا ہے۔ پنجابی ناقدین اور محققین کے لیے ''ہیر'' سدا بہار موضوع ثابت ہوئی، جنھوں نے اس کی تشریح و توضیح اور فنی محاسن گنوانے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لیا، اتنا کچھ لکھا گیا مگر پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہیر کی شہرت صرف پنجاب تک ہی محدود نہ رہی بلکہ بعض شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں بھی یہ مقبول تھی۔ دیکھیے لکھنؤ میں بیٹھا ''دریائے لطافت'' کا مولف انشاء کیا کہہ رہا ہے:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

جب کہ نظیر اکبر آبادی لکڑی کی تعریف یوں کرتے ہیں:

ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے سو وہ یارو رانجھا کی بانسری ہے

نظیرا کبرآبادی کا ایک اور شعر سنیے!

میں تو صفِ محشر میں بھی لوں گا تجھے پہچان
رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشہ

ان سب سے پہلے سراج اورنگ آبادی بھی ایسا شعر کہہ چکے تھے:

مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا و لیکن
رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز

''ہیر''بنیادی طور پر زرعی کلچر کی مظہر ہے جب کہ لکھنؤ اور آگرہ کا کلچر شہری بلکہ شاہانہ تھا۔اس لیے ہیر کی پسندیدگی کا باعث زبان کا تخلیقی استعمال قرار دیا جا سکتا ہے۔اس پر مستزاد ہیر خوانی کی مخصوص لے جس میں سوزِ دیپک کا کام کرتا ہے۔انشا ءاور نظیر ہفت زبان تھے اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہیر کو پنجابی میں پڑھا رسنا ہوگا۔

اردو شاعری میں غزل سب سے زیادہ توانا صنف ہے،ایسی صنف جو طویل تخلیقی روایات کی حامل ہے۔اور صدیوں سے جس نے تخلیقی شخصیات کو اظہار کا سانچا مہیا کیا۔دیگر علاقوں کے مانند اہلِ پنجاب نے بھی غزل کی خدمت کی مگر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ خود پنجابی نے بھی غزل کو اپنایا حالاں کہ پنجابی زبان کے مزاج کی مناسبت سے اس میں شعری اظہار کی کئی صورتیں موجود تھیں لیکن اس کے باوجود بھی غزل نے پنجابی زبان کو ایک نیا طرزِ اظہار فراہم کیا۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے مقالہ ''بُلھے شاہ کی ایک نو دریافت پنجابی غزل''(''دریافت''اسلام آباد،جنوری ۲۰۱۰ء) کے بہ موجب:

''......بابا بُلھے شاہ کی ایک نایاب پنجابی غزل پہلی بار سامنے لائی جا رہی ہے،اس سے محققین کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ پنجابی میں غزل کی ابتدا میاں محمد بخش نے کی۔پانچ اشعار کی اس غزل کو کاتب نے ریختہ کا نام دیا ہے......لفظوں کی تحریری صورت (املا اور کاغذ کی کہنگی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ قائم کرنا دشوار نہیں کہ غزل کم از کم ڈیڑھ سو سال پہلے کی تحریر (کتابت شدہ) ہے۔مقطع میں تخلص کی موجودگی کے علاوہ کئی اندرونی شہادتیں (جیسے موضوعات،لفظیات اور اسلوب) اس غزل کو بابا سائیں کی تخلیق ثابت کرتی ہے۔''

غزل درج ہے:

سانوں لگڑا عشق پیارے دا — سانوں لگڑا جھورا دلدارے دا
اُنہہ دی گھنگھور جو شیاں — وسریا تخت ہزارے دا
موسیٰ چڑھ کوہ طور دے اُپر — جلوہ دیکھ نظارے دا
آپ ہساوے آپ نچاوے — بھیت نہ دتیں لارے دا
بُلھا شاہ دا کُڈھ کے کلیجہ — کندھا چڑیا عشق سوارے دا

اردو اور پنجابی کا تخلیقی مزاج جداگانہ ہے۔پنجابی کا بیشتر شعری سرمایہ فوک اصناف پر مشتمل ہے جیسے ڈھولا، ماہیا، ٹپا، کافی، گیت، دوہڑا وغیرہ۔پنجابی شعری اصناف نے اسی زرعی کلچر سے جنم لیا جو اس خطہ سے مخصوص ہے جب کہ فارسی ماڈل اور دربارداری کے زیرِاثر غزل سمیت اردو کی شعری اصناف کی Sophistication زرعی کلچر کے برعکس ہے لیکن اس کے باوجود پنجابی میں غزل کا پنپنا خاصا معنی خیز ہے۔

زبانوں کا باہمی لین دین ان کے تخلیقی نقوش سنورنے کا باعث بنتا ہے اور اس عمل سے زبان باثروت ہوتی ہے اور زبان سے وابستہ تخلیقی امکانات وسعت پذیر ہوتے ہیں۔

ان دنوں اگر ایک طرف جاپانی ہائیکو سے رغبت کا اظہار کیا جا رہا ہے تو دوسری جانب پنجابی ماہیا اردو میں فروغ پا رہا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو سب سے پہلے اختر شیرانی نے اردو ماہیا کا تجربہ کیا تھا۔تازہ کام ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کے ماہیوں کا مجموعہ ''ماہیا رے ماہیا'' ہے۔اردو نے غزل دے کر ماہیا لیا تو یہ گھاٹے کا سودا نہ ہوا، جہاں تک اردو میں پنجابی کلچر کی عکاسی کا تعلق ہے تو بیشتر اہلِ قلم نے اپنی فکشن کے ذریعہ سے پنجاب کی عکاسی کی، تاہم اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ خصوصی حوالہ قرار پاتے ہیں۔ہر چند کہ دونوں کا موضوع پنجاب ہی ہے لیکن دونوں کے افسانوں میں برعکس پنجاب نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے ایک پسماندہ گاؤں میں جنم لیا تھا اس لیے ندیم نے جو کچھ لکھا وہ مشاہدہ پر مبنی ہے۔ان کے جتنے بھی مشہور افسانے ہیں، سبھی گاؤں کے پس منظر میں لکھے گئے۔احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دو باتیں فوری طور پر متوجہ کرتی ہیں، ایک ان کا شاعرانہ اسلوب، جس سے وہ مناظر کی خوب صورت عکاسی کرتے ہیں اور دوسرا فطرت کے حسن کے تناظر میں سرکردہ افراد کا غریب غربا پر ظلم۔اگر طبقاتی کشمکش کا بدترین مظاہرہ دیکھنا ہو تو وہ ندیم کے افسانوں میں ملے گا۔یہ محض اس لیے نہیں کہ ندیم ترقی پسند تھے بلکہ اس لیے کہ پنجابی دیہات میں ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ پنجاب ہی کی تخصیص کیوں؟ پاکستان کا کون سا ایسا خطہ نہیں جہاں عورتوں کو ناک کی خاطر قتل نہ کیا جاتا ہو، جہاں انھیں زندہ درگور نہ کیا جاتا ہو اور جہاں انھیں کتوں کی غذا نہ بنایا جاتا ہو۔اخبارات ایسے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں لیکن ان پر قلم اٹھانے والا کوئی ندیم نہیں۔انھوں نے ''طلوع وغروب'' (۱۹۴۲ء) کے دیباچہ میں لکھا تھا:

> ''حقیقت یہ ہے کہ شمال مغربی پنجاب سے زیادہ میں نے دنیا کے اور کسی حصے کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور جہاں تک مجھے پنجاب کے دیگر اضلاع کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، میں نے دیہاتی زندگی کے بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں پایا۔گاؤں میرے افسانوں کے لیے صرف پسِ منظر کا کام دیتا ہے اور اس میں رہنے بسنے والے انسان میرے افسانوں کے کردار ہیں۔انسانی دل کی دھڑکن دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہے، دُکھ سُکھ کا قانون ہندوستان کے دیگر حصوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی وہی ہے جو ان دیہات میں رائج ہے۔ میں نے دیہاتی زندگی پر صرف اس لیے قلم اٹھایا تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگ میں پیش کرنے والا مجھے کوئی نظر نہ آیا۔''

احمد ندیم قاسمی کے دعویٰ کی تصدیق ان افسانوں سے ہو جاتی ہے۔''طلوع وغروب''، ''گونج''، ''جوانی کا جنازہ''، ''جوتا''

..........”جب بادل اُمڈ ے“،”خربوزے“،”سانولا“،”شعلۂ نم خوردہ“،”اکیلی کرن“،”چڑیل“،”رئیس خانہ“،”لارنس آف تھیلیا“،”آتش گل“،”الحمدللہ“، ”کنجری“،”گنڈاسا“،”چور“،”بیٹے بیٹیاں“،”شکنیں“،”وحشی“،”جن وانس“،”ووٹ“، ”اورکہانی لکھی جارہی ہے“،”پکا مسلمان“،”شیش محل“۔ یہ اوراس انداز و اسلوب کے دیگر افسانے مل کر اس”موزیک“ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں جس کا نام ہے پنجاب!

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کا حسن اور پنجابی دونوں داغ دار نظر آتے ہیں۔فطرت کے حسن کے تناظر میں انسانی المیہ زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے مگر بلونت سنگھ کے افسانوں میں اس کے برعکس رویہ ملتا ہے۔بلونت سنگھ نے خود کو صرف سکھوں تک محدود رکھا۔ یوں وہ صرف ایک طبقہ کو مُحدّب شیشہ میں رکھ کر اس کا کامیاب تجزیاتی مطالعہ کرسکا۔”جگا“،”پہلا پتھر“، ”کالے کوس“، ”تغیر“،کالی تیتری“،”پنجاب کا البیلا“،”بابا مہنا سنگھ“۔ یہ اوراس انداز و اسلوب کے بعض اورافسانوں میں سکھوں کے ذریعہ سے پنجاب کے نقوش نمایاں ہوتے ہیں۔قاتلوں اور ڈاکوؤں والا پنجاب مگر وحشت اور جنون میں بھی سکھ کی روح اوراس کی معصومیت ہی جھلک رہی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے اگر چہ بطورخاص سکھوں کو تو موضوع نہ بنایا مگر”ایک چادر میلی سی“ میں اس نے سکھوں کی معاشرت کے حوالے سے”چادر ڈالنے“ (جوان بیوہ بھاوج سے دیور کی شادی پر) کے بارے میں دلچسپ طویل افسانہ قلم بند کیا ہے۔بیدی انسانی نفسیات کا ماہر نباض ہے اور”اک چادر میلی سی“ میں بھی اس نے”ہاں“اور”نہیں“ سے وابستہ جذباتی کشمکش اجاگر کی ہے۔

بلونت سنگھ اور راجندر سنگھ بیدی نے جہاں بات ختم کی،گیان سنگھ شاطر نے اس نام کے ناول میں سکھوں کی Crude جنسی زندگی، گندے لطیفے، گالیاں،نفرت،محبت سب کچھ اردو پنجابی پر مبنی مفرس اسلوب میں کمال چابک دستی سے بیان کر ڈالا۔یوں سمجھیے کہ اس نے سکھ کا بدبودار”کچھا“ پبلک میں دھو ڈالا لیکن اسے نیل سے دھو کر صاف کر کے سوکھنے کو دھوپ میں ڈالنے کے برعکس ویسا ہی رہنے دیتا ہے۔

پنجاب کے حوالہ سے اور بھی کام ہوا ہے جیسے جمیلہ ہاشمی کا ناولٹ”روہی“،غلام الثقلین نقوی کا”میرا گاؤں“اور فرخندہ لودھی کے بعض افسانے۔پنجاب ایک خطہ کا نام نہیں بلکہ ایک طرزِ حیات کا نام بھی ہے۔پنجاب کی روح ایک چیلنج ہے تخلیق کاروں، مصوروں اور محققوں کے لیے۔موسم، پنکھ پکھیرو، ڈھور ڈنگر، دھرتی اوراس دھرتی کے باسی اس انفرادیت کے حامل ہیں جو تخلیق کاروں، مصوروں اور محققوں کے لیے ایک دائمی چیلنج ہے۔

تصورزمان ومکان۔عراقی سے عین القضاۃ تک

ڈاکٹرمحمدعلی صدیقی

جریدہ مخزن کے ڈاکٹرعبدالوحیدقریشی نمبر میں شائع شدہ ڈاکٹرارشدمحمودناشاد کے مضمون بہ عنوان ''مکاتیب ڈاکٹر وحید قریشی بہ نام نذرصابری'' میں رسالہ 'غایۃ الامکان فی درایۃ المکان' کے مصنف کا نام شیخ محمودواشنوی لکھا گیا ہے۔علامہ نے صوفی بزرگ عراقی کومصنف قراردیا تھا۔نذرصابری نے اس رسالے کی اشاعت (۱۹۷۸ء)ص۱۶ میں مصنف کانام محمداشنوی تحریر کردیا تھا۔آخر یہ رسالہ کیا تھا،چھٹی صدی ہجری کے اس رسالے کے اصل مصنف کا نام عین القضاۃ تھا،اس نے اپنے رسالے ''غایۃ الامکان فی درایۃ المکان'' کے مصنف نے مادی اشیااورروحانی اشیا کےتصورمکان اور وقت میں فرق کی وضاحت کی تھی۔مصنف شافعی تھےاورتصوف کے وحدت الوجودی سلسلہ سے متاثر ہونے کی وجہ سےنوجوانی میں اپنےتصورزمان ومکان کی وجہ سےقتل کر دیے گئے تھے۔اس دورمیں معتزلہ مکتب فکر کےوکلاءآزادخیالی کے جرم میں زیرِعتاب تھے۔

نذرصابری سے پہلےبعض ایرانی محققین کابھی یہی خیال تھالیکن ڈاکٹررحیم فرمنش نے پہلی بار۱۳۳۸ش میں (صفحہ۴۴)لے اس رسالے کا مصنف عین القضاۃ ثابت کیا۔علامہ اقبال نے اس رسالے کا مصنف اس رسالے میں ایک جگہ صوفی بزرگ عراقی کا نام آجانے سےمولانافخرالدین عراقی کوسمجھا......علامہ اقبال زمان ومکان کےتصورات کے بارے میں اسلامی فکر کے ذخیرۂ علمی کی کھوج میں ایک عرصہ غلطاں رہے۔

علامہ اقبال کےدرج ذیل اشعارزبان ومکان کے بارے میں علامہ کی دلچسپی کامظہر ہیں:

تو کہ از اصل زماں آگہ نۂ — از حیات جاوداں آگہ نۂ
زندگی از دہر و دہر از زندگی ست — لا تسبو الدہر فرمان نبی ست
عشق سلطان است و برہان مبیں — ہر دو عالم عشق را زیر نگیں
لازماں و دوش فردا از و — لامکان وزیر بالاے از و
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست — لی مع اللہ باز خواں از عین جاں

....

زمانہ ایک،حیات ایک،کائنات بھی ایک — حدیث کم نظری قصہ قدیم و جدید
خرد ہوئی ہے زبان و مکان کی زناری — نہ ہے زباں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زیادہ مکاں اور بھی ہیں

ڈاکٹر جاوید اقبال تک اپنے مضمون بہ عنوان .... مشمولہ 'وحدت الوجود' مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت اسی غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں حالاں کہ بی۔اے ڈار اور پروفیسر لطیف اللہ اس مسئلے پر کافی صراحت کے ساتھ قلم اٹھا چکے ہیں، شاید ان کی نظر سے بی۔اے ڈار کا مضمون 'اقبال اور مسئلۂ زماں و مکاں (ماہ نو اقبال اپریل ۱۹۷۰ء)'' بھی نہیں گزرا جس میں علامہ اقبال کی طرف سے اس رسالہ کو عراقی سے منسوب کر دینے کو التباس قرار دیا گیا ہے۔ڈاکٹر ناشاد کی نظر سے اس رسالہ کے مترجم اور مولف لطیف اللہ (۱۹۸۴ء) کا مقدمہ بھی نہیں گزرا اور اس لیے ڈاکٹر جاوید اقبال تک اسی رسالے کے اصل مصنف کے بارے میں لاعلم رہے۔ علامہ اقبال ہی کیا حضرت نظام الدین اولیاء (فوائد الفواد) اور عبدالرحمٰن جامی (نفحات الانس) بھی اس رسالہ کے اصل مصنف کے نام سے بے خبر تھے۔ہندوستان میں پہلی بار خاندان ولی الٰہی کے شاہ رفیع الدین دہلوی (صفحہ ۲۳)[۲] اس رسالے کے مصنف کے صحیح نام سے واقف ہوئے اور انھوں نے اس رسالہ کے بارے میں تحریر کیا:

صوفیہ نے غیب وشہادت کے ہر مقام پر زماں و مکاں کا وہ مشاہدہ کیا جو دوسرے مقام کے خلاف تھا۔اس کی تفصیل عین القضاۃ نے رسالہ زمانیہ و مکانیہ (رسالہ مذکور کے نام کا خلاصہ) میں کی ہے اور میں اس سے خاموش رہا، کیوں کہ مقصد محض تمثیل ہے معاملہ کی تحقیق کا ارادہ نہیں ہے۔شاہ رفیع الدین دہلوی۔بحوالہ رسالہ ہذا کا اردو ترجمہ (لطیف اللہ) صفحہ ۲۶)[۳]

اب میں اس اہم رسالہ کے اصل مصنف کے بارے میں محققین کا نتیجہ فکر کچھ یوں ہے کہ چوں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اکثر مصنفین اپنے تصنیف کردہ رسائل اور کتب پر اپنا نام رقم کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور اکثر رسالہ یا کتاب کے آخر میں نام رقم کرنے پر اکتفا کرتے تھے، اس لیے اکثر کتب کے مصنفین کے بارے میں اشکال پیدا ہوتا ہے اور اس رسالے کے ساتھ بھی یہی ہوا اور پانچویں صدی ہجری کے ایک صوفی کی تصنیف کردہ کتاب علامہ اقبال کی حد تک چودھویں صدی ہجری تک اصل مصنف عین القضاۃ کے بجائے صوفی بزرگ عراقی کی تصنیف شمار ہوتی رہی اور شاید یہ اقبال ہی کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ عراقی کی شاعری کی تعبیریں بھی عین القضاۃ کے بجائے عراقی کے تصور زماں و مکاں سے متصف ہوتے رہے۔شاید اس لیے کہ بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی کی شاعری وحدت الوجود کے زیر اثر 'لامکاں' و 'لازماں' کے تصورات سے متاثر ہے۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہلاکو خاں اور اس کی اولاد کی تباہ کاریوں نے صوفیوں کی خانقاہیں زمانے کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے پناہ گاہیں بن گئی تھیں۔اس صورت میں ایک عراقی ہی کیا یہ خیال متعدد شعرا کے کلام پر صادق آتا ہے۔

حضرت عین القضاۃ عبداللہ بن محمد ہمدانی ۵۲۵ ہجری میں ۳۳ برس کی عمر میں اس جرم میں قتل کر دیے جانے کے بعد جلا دیے گئے تھے (صفحہ ۵۶)[۴] کہ ان کے اقوال میں کچھ ایسے اشارے اور کنایے تھے جنھیں کفر اور زندقہ پر محمول کیا جانے لگا تھا۔اس دور میں اگر کسی عالم کے بیان یا کتاب میں تشبیہ کا گمان بھی ہو جاتا تو اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا تھا۔عین القضاۃ کے والد بہ عہدۂ قضا مامور تھے۔خود ان کے لقب عین القضاۃ سے علم و فضل کے میدان میں ان کی شہرت ہے۔وہ لطیف اللہ کے مطابق اپنے عہد کے دو بڑے شیوخ محمد بن حمویہ (۵۳۰ ہجری) اور خواجہ احمد غزالی (۵۱۷ ہجری) کے صحبت یافتہ تھے۔وہ ۴۹۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۲۵ھ

میں قوام الدین ناصر بن علی ابوالقاسم درگزینی کے حسد وعتاب کا نشانہ بنے۔ رسالہ غایۃ الامکان فی درایۃ الامکان ڈاکٹر رحیم فرمنش کے مقالہ 'احوال وآثار عین القضاۃ' پر تحقیق کے دوران دریافت ہوا اور یہ رسالہ ڈاکٹر فرمنش کے تحقیقی مقالے کے ساتھ ہی شائع ہوا۔

علامہ اقبال نے حضرت فخر الدین عراقی کی بابت اورینٹل کالج کے سالانہ اجلاس (۱۹۲۸ء) میں زماں ومکاں کے بارے میں جن خیالات کو عراقی سے منسوب کیا تھا، وہ دراصل عین القضاۃ کے خیالات تھے۔ علامہ اقبال نے مسئلہ زماں ومکاں کی بابت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا انور شاہ کشمیری اور حضرت مہر علی شاہ گولڑوی سے رابطہ کیا تھا اور وہ بالآخر اس رسالے کو مولانا سید سلیمان ندوی کے توسط سے علامہ انور شاہ کشمیری سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مولانا برکات احمد سے ان کا رسالہ ''اتقان فی ماہیت الزماں'' بھی حاصل کیا، اس کے باوجود وہ بربنائے شہرت حضرت فخر الدین عراقی کو اس رسالے کا مصنف خیال کرتے تھے اور ماہرین اقبالیات کے لیے بی۔ اے۔ ڈار کے مقالہ کے ساتھ لطیف اللہ کے ترجمہ ''غایۃ الامکان فی درایۃ المکان'' (۱۹۸۴ء) سے استفادہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لطیف اللہ کے ترجمہ پر اپنے پیش لفظ میں اس رسالے کی اہمیت واضح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''عین القضاۃ کے خیال کے مطابق 'حق تعالیٰ کی اولیت وآخرت، ظاہریت وباطنیت کا جاننا بھی ممکن نہیں اور یہ کہ حق تعالیٰ بہ یک علم تمام لامتناہی مقدورات کو وجود عطا کر سکتے ہیں اور بہ یک ساعت تمام لامتناہی مسموعات کو سن سکتے ہیں اور بہ یک نگاہ ازل سے ابد تک تمام مرئیات کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان تمام رموز کا علم ومعرفت بغیر حق تعالیٰ کے زمان ومکان کے علم ومعرفت کے ممکن نہیں۔''

میں نے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے مضمون میں نذر صابری کے بارے میں تعارفی نوٹ (صفحہ ۱۴۸)[۵] میں جریدہ غایۃ الامکان فی درایۃ المکان کے اصل مصنف کے بارے میں جب شیخ محمود اشنوی (مخزن شمارہ ۱۹ صفحہ ۱۴۸) کے نام پڑھا تو یہ خیال گزرا کہ قارئین پر واضح کر دیا جائے کہ اس رسالہ کے مصنف کا نام عین القضاۃ (متوفی ۵۲۵ ہجری) ہے کہ قارئین علامہ اقبال کے ممدوح کا اصل نام واضح ہو جائے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ تسوید وترجمہ رسالہ غایۃ الامکان فی درایۃ المکان از لطیف اللہ، مکتبہ ندیم، ناظم آباد کراچی (۱۹۹۴ء) صفحہ ۴۴

۲۔ تسوید وترجمہ رسالہ غایۃ الامکان فی درایۃ المکان از لطیف اللہ، مکتبہ ندیم، ناظم آباد کراچی (۱۹۹۴ء) صفحہ ۲۳

۳۔ تسوید وترجمہ رسالہ غایۃ الامکان فی درایۃ المکان از لطیف اللہ، مکتبہ ندیم، ناظم آباد کراچی (۱۹۹۴ء) صفحہ ۲۶

۴۔ تسوید وترجمہ رسالہ غایۃ الامکان فی درایۃ المکان از لطیف اللہ، مکتبہ ندیم، ناظم آباد کراچی (۱۹۸۴ء) صفحہ ۵۶

۵۔ رسالہ مخزن (۱۹) ڈاکٹر وحید قریشی نمبر، قائداعظم لائبریری، باغ جناح لاہور (۲۰۱۰ء) صفحہ ۱۴۸

مجید امجد کی شعری کائنات۔۔ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد اصغر یزدانی

مجید امجد نے کہا تھا ؎

عمر اسی الجھن میں گزری
کیا شے ہے یہ حرف و بیاں کا
عقدۂ مشکل؟
صورتِ معنی؟ معنیٔ صورت؟

بیس برس کی کاوشِ پیہم
سوچتے دن اور جاگتی راتیں
ان کا حاصل:
ایک یہی اظہار کی حسرت! [1]

(حرفِ اوّل)

ایک بڑے شاعر کی یہ خوبی ہے کہ وہ بہت کچھ کہہ کر بھی سمجھتا ہے کہ ابھی بہت کچھ اور کہا جا سکتا ہے یا بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ اس کے ہاں داخلی اور خارجی امکانات کی وسیع دنیا آباد ہوتی ہے جو اس کے شعور کو قوتِ ناطقہ سے ہم آہنگ کیے رکھتی ہے۔ مجید امجد نے ساری زندگی عناصرِ کائنات کے متعلق بہت کچھ کہا مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ لوگوں نے اسے عقدۂ مشکل سمجھ کر اس پر ابہام و مشکل پسندی کی دبیز تہیں چڑھا دیں۔ جو لوگ مجید امجد کی زندگی میں ان کے بہت قریب رہے اُن میں سے بھی بعض نے امجد کی شعری کائنات کو ایسا معما قرار دیا کہ جس کا سمجھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ جب کہ اس بات سے سب متفق ہیں کہ مجید امجد بنیادی طور پر سادہ، سیدھے سادے اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کی شخصیت میرا جی کی طرح ایسی گنجلک نہیں تھی کہ جس کو کوئی نام نہ دیا جا سکے۔ میرا جی کی شخصیت کی پیچیدگی نے ان کی شاعری میں ابہام کی فضا کو جنم دیا، مگر مجید امجد کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ ان کی شخصیت تو انسانیت کی کھلی کتاب تھی تو پھر ان کی شاعری میں اس قدر مشکل پسندی اور ابہام کا چرچا کیوں ہوا۔ اور پھر ان اعتراضات کے باوجود انھیں

’’رفعتِ مقام‘‘ اور ’’شہرتِ دوام‘‘ کیسے نصیب ہوئی۔ اس کے لیے مجید امجد کے فنِ شاعری کو مختلف حوالوں سے دیکھنا ہوگا۔

عموماً کسی شاعر کے فن کا تجزیہ کرتے وقت اس کے معنوی و موضوعاتی رجحان کو پہلے زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور اس کے اسلوب کو بعد میں۔ مگر مجید امجد کے معاملے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کے موضوعات یا فکری رجحان سے پیشتر ان کے اُسلوب اور شاعری کے ہیئتی حسن پر ایک نظر ڈالی جائے، کیوں کہ مجید امجد کلام کی معنوی اہمیت کے ساتھ ساتھ اظہارِ معانی کی ظاہری صورت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ محض اظہار کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کے نزدیک اظہار کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنا مناسب عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسلوب میں انفرادیت پیدا کرنے کے لیے بڑی محنت اور ریاضت سے کام لیا۔ انھوں نے ہیئت کے متعدد تجربے کیے، بے شمار نئی تراکیب وضع کیں، الفاظ کے استعمال میں جدّت پیدا کی، گویا اپنے شعری ایوان کی ’’ایک ایک سل‘‘ کی تراش خراش نہایت جاں فشانی سے کی۔

مجید امجد نے خوبصورت غزلیں بھی کہیں مگر وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ انھوں نے ابتدا میں نظم کی روایتی ہیئت میں طبع آزمائی کی، ان نظموں میں ہیئتی تجربوں کی طرف ان کی توجہ کم ہی نظر آتی ہے، مگر بعد میں وہ آزاد نظم کی طرف مائل ہوئے اور اس ہیئت میں تجربات کے تنوع اور مہارت کے سبب بلند مقام پایا۔ امجد کی ابتدائی آزاد نظموں میں پابند نظم کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں مثلاً پابند نظم میں قافیے کے استعمال سے جو رنگ پیدا کیا جاتا ہے، امجد نے شروع کی نظموں میں اس کو برقرار رکھا پھر اندرونی قافیے کی شکل جس کا استعمال خاص طور پر راشد کے ہاں نظر آتا ہے، امجد نے بھی اسے اپنایا مثلاً مجید امجد کی ایک نظم ’’ہم سفر‘‘ کا کچھ حصہ دیکھیے:

ابھی ابھی سبز کھیتیوں پر
جو دور تک مست آرزوؤں کی موج بن کر لہک رہی ہیں
سیاہ بادل جھکے ہوئے تھے
اور اب، حسیں دھوپ میں نہاتی فضائیں زلفیں جھٹک رہی ہیں

طویل پٹڑی کے ساتھ رقصاں
مہیب پیڑوں کے گونجتے جھنڈ! دراز سایوں سے پٹتی راہیں
کہ جن کی موہوم سرحدوں پر
نکل کے گاڑی کی کھڑکیوں سے، تری نگاہیں مری نگاہیں
الگ الگ آ کے تھم گئی ہیں
اور اک اندازِ بے کسی میں، مآلِ امروز سوچتی ہیں! [۲]

آزاد نظم میں قافیے کے استعمال کو مجید امجد نے جلد ہی ترک کر دیا بلکہ ان کے آخری دور کی نظموں میں تو قوافی سے قطعی انحراف نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں الفاظ کے استعمال میں مرصّع سازی کا جو خاص اہتمام نظر آتا ہے، وہ بھی بعد میں معدوم ہو گیا۔ اس بارے میں مجید امجد کے ایک قریبی دوست جعفر شیرازی نے راقم کو ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ مجید امجد نظم کا خیال کسی عام منظر یا واقعے سے لیتے اور پھر اس کو ایک خاص شعری ہیئت میں ڈھال دیتے، مگر اس کی تزئین و آرائش کے لیے

الفاظ کے انتخاب کا مرحلہ کئی کئی دنوں تک محیط ہوتا تھا۔اس کے لیے امجد لغت سے بھی مدد لیتے اور نسبتاً کم مستعمل مگر دلکش الفاظ تلاش کر کے نظم میں ردّوبدل کرتے رہتے تھے۔[۳] اس رجحان میں تبدیلی کے بارے میں بلراج کومل کا کہنا ہے کہ:

"اندورنی قافیہ جس کے وہ ہاپکنز (HOPKINS) کی طرح دلدادہ تھے اور جس کا استعمال وہ اکثر کرتے تھے ان کے ہاں آہستہ آہستہ مقابلتاً محدود ہوگیا۔مرصّع کاری اور تزئین کاری ان کے ہاں رفتہ رفتہ ثانوی حیثیت اختیار کرگئی"۔[۴]

مجید امجد کے ہاں نظم میں روایتی انداز سے انحراف بحر کے معاملے میں بھی نظر آتا ہے۔انھوں نے آزاد نظم کہنے کے لیے روایتی اور مروج بحروں کو ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ انھوں نے بحر میں تبدیلیاں کرکے الگ راہ نکالی۔امجد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کسی بحر کو توڑ کر یا اس کے زحافات سے جو تجربہ کیا، وہ بجائے خود ایک فن پارے کی حیثیت اختیار کرگیا۔انھوں نے دو سو سے زائد آزاد نظمیں کہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر نظموں، بالخصوص آخری دور کی نظموں میں ایک ہی بحر "متقارب" کو برتا ہے۔اس بحر کی پسندیدگی کی وجہ شاید یہ تھی، چوں کہ یہ بحر نثری ترتیب کے قریب ہے اور دوسری بحور کے مقابلے میں سُست رو بھی، اس میں آہنگ برقرار رکھتے ہوئے نثری ترتیب کے قریب رہنا آسان ہے، اس لیے امجد وفات تک اس بحر میں نظمیں لکھتے رہے۔[۵] بقول بلراج کومل امجد اس بحر کے اس قدر رسیا ہوگئے تھے کہ وہ اس کو الفاظ و ارکان کی ترتیب میں نثر کے قریب لے گئے۔[۶] تاکہ قاری کو اپنی نظموں کے مزاج سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔چوں کہ اس بحر کا آہنگ عام بول چال کا سا ہے، اس لیے بعض اوقات امجد کی نظموں پر نثری نظم کا گمان ہوتا ہے اور مجید امجد ایک ایسے فلسفی کے روپ میں سامنے آتے ہیں جو کسی سے ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر گفتگو کر رہا ہو اور اس کا سامع غور رہے جیسے یہ باتیں دل میں اُتار رہا ہو۔ممکن ہے طائرانہ نظر سے ان نظموں کو پڑھنے والا قاری کچھ وقت محسوس کرے اور اس کو بھرپور شعریت اور غنائیت کا احساس نہ ہو لیکن وہ اگر ذرا رک کر اور مفاہیم پر غور و فکر کے ساتھ ان نظموں کو پڑھے تو اُسے صورت حال اس کے برعکس نظر آئے گی۔چناں چہ اس بحر کے استعمال سے متعلق مجید امجد کا کہنا ہے:

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں زیادہ سہولت کے ساتھ اس بحر میں کہہ سکتا ہوں۔اس کی شکل ایسی ہے کہ اس بحر میں فعلن فعلن، فعل فعولن، فاعلن اور مفاعلاتن سارے رکن لگ سکتے ہیں جن بحروں میں میں پہلے لکھتا تھا وہ بہت معروف ہیں۔پڑھنے والا انھیں روانی سے پڑھ سکتا ہے میری نظم کا روانی سے تاثر کم ہو جاتا ہے۔ان نظموں کے مضمون کا تقاضا ہے کہ پڑھنے والا رک کر پڑھے گا تو میری نظم کو "ENJOY" کر سکے گا اور اگر رواں پڑھے گا تو وہ اسے MISS کرے گا، جس پر میں INSIST کرتا ہوں۔"[۷]

ویسے تو مجید امجد کی ہر نظم اس کی مثال ہے، یہاں ان کی نظم "کیسے دن ہیں" پیش کی جاتی ہے ؎

کیسے دن ہیں! اب کے تو مجھ جیسے طاغی کو بھی، جس کی غفلت اتنی دوختہ چشم ہے
تو نے دکھائے
اپنے زمانے...... جب وہ غیب کدوں سے چھلک کر پت جھڑ کی صبحوں میں جھلک پڑتے ہیں،
اپنے چشمے: جب ان میں بادل بجتے ہیں،
اپنی جنتیں: جب وہ دوام کے نُور سے لد جاتی ہیں،

میں کب اس قابل تھا.....
دنیا میں کون اس قابل تھا،
دیکھ لے، ان راہوں پر، تیری دنیا کے لوگ اپنے قیمتی فرغلوں، میلے کمبلوں میں ڈوبے ہوئے کتنے
بے نسبت پھرتے ہیں، ان مست ہواؤں سے، جو تیرے لاکھوں جہانوں کی گردش کا ثمر ہیں![۸]

امجد نے بحرِ متقارب کے اصل رکن فعولن کی تکرار یا اس کے زحافات کو بنیاد بنا کر ایسی مسحور کن نظمیں کہی ہیں جو اپنے غنائی آہنگ اور ہیئتی تجربے کے لحاظ سے شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً فعولن کی تکرار سے کہی گئی نظم "کنواں"، "پہاڑوں کے بیٹے"، "جلوسِ جہاں" فعول فعلن کی تکرار سے "صاحب کا فروٹ فارم" اور فعلن کی تکرار سے "اے رے من" وغیرہ۔ امجد کا کمال یہ ہے کہ وہ بحر کے بنیادی رکن میں تبدیلی کرتے ہیں اور نظم میں مفاہیم کا تاثر قائم کر کے سطروں کو چھوٹی بڑی بھی کرتے ہیں مگر وہ نظم کے آہنگ کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ اس کے لیے انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کسی سطر کے اختتام پر رکن عروضی کی اکائی ٹوٹنے نہ پائے۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ہوا کہ ان کے ہاں کسی سطر کا خاتمہ "فعو" پر ہوا اور اس سے اگلی سطر "لن" پر شروع ہو جائے۔ جب کہ ان کے پیش رو کئی شعراء کے ہاں ارکان کے ٹکڑوں کو دو سطروں میں پھیلانے (RUNNING VERSE) کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ ارکان کی اس تقسیم سے گو بحر متاثر نہیں ہوتی لیکن شاعر اگر آرٹ آف ریڈنگ (ART OF READING) سے واقف نہ ہو تو ایسی نظم سننے والوں کو بے آہنگ محسوس ہو گی اور ایک عام قاری تو شاید اسے نثر ہی سمجھے۔

مجید امجد نے بحور کے معاملے میں جدّت دکھانے کے ساتھ ساتھ نئی تراکیب بھی تراشیں۔ گو کہ ان کے سامنے اردو شاعری میں مروج تراکیب کا ایک سلسلہ موجود تھا، مگر امجد نے شاید اسے ناکافی سمجھا، ویسے بھی وہ بنی بنائی اور ڈھلی ڈھلائی فرسودہ زبان میں لکھنے کے قائل نہیں تھے[۹] انھیں اس بات کا احساس تھا کہ تراکیب کے استعمال سے شاعری میں خارجی حُسن کے ساتھ افکار کے ابلاغ میں آسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مجید امجد ایک کثیر المطالعہ شخص تھے، انھیں اردو، انگریزی، ہندی، عربی اور فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مختلف زبانوں کے خوبصورت الفاظ کی کثرت اور نادر تراکیب کا ایک مکمل نظام نظر آتا ہے۔ یہ تراکیب انھوں نے نظموں میں جس طرح استعمال کیں، وہ انھیں کا خاصہ ہے۔ آبِ آگہی، آوارگانِ فطرت، ادائے کج کلہی، امیدِ التفات، بارشِ احساس، بانگِ بقا، برگِ دریدہ جاں، برگِ مرگ، بزمِ آفاق، بہ گنبدِ الفاظ، بیانِ الم، بہ مصحفِ احساس، پیراہنِ خاشاک، تودۂ خاکسترِ ایام، جامۂ برف، حصارِ بے دیوار، حلقومِ گوسفنداں، زرِ جاروب، حیلۂ جاروب، خمِ افلاک، خیالِ ابدِ موج، دنیائے بے طریق، رختِ جانِ خودداری، قوتِ یک شب، گلبنِ غمِ ہستی، لطفِ کریمانۂ خوشدلاں، مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی، ہجومِ کرمکِ کورِ بخ کدۂ یقینِ غم، خروشِ انبوہِ پابجولاں، تابشِ سلکِ صد گہر۔ ایسی نئی نویلی اور البیلی ان گنت تراکیب مجید امجد کی شاعری میں نگینے کی طرح جڑی نظر آتی ہیں۔ انھی اسلوبیاتی خصائص کے پیشِ نظر سیّد عامر سہیل نے درست کہا ہے کہ مجید امجد کے ہیئتی، بحور اور اسلوب ولفظیات کے تجربات آیندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔[۱۰] نقادوں کی آرا اور مجید امجد کے اسلوب کی بوقلمونی سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ امجد ہیئت اور نئے تجربات کو ہی اپنا شعری منصب سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں فارم یا ہیئت اہم ضرور ہے مگر یہ ہمیشہ موضوع اور مواد کے تابع نظر آتی ہے۔

مجید امجد نے موضوع اور مواد کے معاملے میں بھی اُردو نظم کو نئے روپ سروپ سے آشنا کیا۔ انھوں نے موضوعات کے لیے

کسی تحریک یا فلسفیانہ فکر کا سہارا نہیں لیا بلکہ اپنے اردگرد بکھری اشیاء اور مناظر کو اپنے دھیان گیان میں اُتار کر انھیں ایک نئے زاویہ فکر سے مربوط کر کے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ مجید امجد کے نزدیک ہر نظر آنے والی چیز شاعری ہے اور کسی معمولی سے معمولی موضوع کو غیر شاعرانہ (UN POETIC) نہیں کہا جا سکتا۔ مجید امجد کا کمال یہ ہے کہ جن موضوعات کو عام شعراء غیر شاعرانہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، مجید امجد نے ان سے اعلیٰ درجے کی شاعری تخلیق کی ہے۔[۱۱] وہ معمولی اشیا اور واقعات کو کبھی سماجی پس منظر کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور کبھی کائناتی پس منظر سے اس کا منطقی ربط تلاش کرتے ہیں۔ ان کی بہت سی نظموں کو بعض ناقدین نے عجیب و غریب معنی پہنا دیے ہیں۔ بلاشبہ وہ نظمیں عظیم الشان فن پارے کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن ان کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کا تخلیقی پس منظر جاننا بہت ضروری ہے۔ ان نظموں کی تخلیق کا صحیح پس منظر معلوم کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ مجید امجد نے نہایت معمولی واقعات کو اپنے شعری وجدان کی مدد سے کائنات کی ازلی حقیقتوں کو آشکار کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کا کلام اس بات پر شاہد ہے کہ انھوں نے کبھی کسی معمولی شے سے بچ کر یا اس سے صرفِ نظر کر کے گزرنے کی کوشش نہیں کی۔[۱۲] مثال کے لیے مجید امجد کی نظم ''پچاسویں بت جھڑ'' کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے، عمر کے پچاس برس مکمل ہوئے تو مجید امجد کا ایک دانت ٹوٹ کر گر گیا۔ دیکھیے دانت ٹوٹنے کے معمولی واقعہ کو مجید امجد نے اپنے منفرد انداز و الفاظ سے کتنا خوب صورت رنگ دیا ہے:

میں اب کس کو بتاؤں کہ مرے پیکر میں
اک تپش ایسی بھی ہے، جس کے سبب
رُوح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے
سانس کے بل میں پنپنے کی سکت مٹتی ہے
ٹوٹتی کڑیوں میں جینے کے جتن جڑتے ہیں،
میں یہ اب کس کو بتاؤں، کہ مرے جسم کے ریشوں کے اس اُلجھاؤ میں ہے
ایک وہ گرتی سنبھلتی ہوئی نازک سی دھڑکتی ہوئی لہر
جو ہر اک دُکھ کی دوا ڈھالتی ہے،
جو گزرتے ہوئے لمحوں کے قدم روکتی ہے،
مجھ سے کہتی ہے "دیکھا ایک برس اور بجھا،
دیکھا اب کے تری بتیسی پہ دھبا سا پڑا، دانت گرا،

گھاؤ یہ اب نہ بھرے گا، یہی بہتر ہے کہ ہونٹوں پہ لگا لے کسی جھوٹی سی کڑی سوچ کی مہر
اب کے تو ایک مجھی کو یہ خبر ہے کہ میں کیوں مہر بلب پھرتا ہوں،
ورنہ سب لوگ یہی کہتے ہیں ''اس شخص کو دیکھو، اب تو
اس کے ہونٹوں سے وہ مرجھائی ہوئی موج تبسم بھی گئی'' [۱۳]

ساہی وال میں مجید امجد کے ایک دوست شیخ عبدالحفیظ ایڈووکیٹ کی کوٹھی کے باہر اور اندر قطار اندر قطار رنگا رنگ پھولوں

کے پودے تھے، مجید امجد دفتر جانے کے لیے ادھر سے گزرتے تو انھیں دیکھ کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ شیخ صاحب نے کوٹھی کی تزئین و آرایش کرنے کے لیے کچھ تزامیم کیں تو یہ خوبصورت پھولوں کے تختے ختم ہو گئے۔ شیخ صاحب کے لیے یہ ایک معمولی بات تھی مگر مجید امجد نے اپنے احساسات کو نظم "دروازے کے پھول" میں الفاظ کا ایسا روپ دیا ہے کہ یہ منظر اور واقعہ اپنی تابانیوں کے ساتھ قاری کے ذہن کو معطر بھی کرتا ہے اور ایک نئے زاویۂ فکر سے بھی آشنا کرتا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

صبح کی دھوپ اُن پھولوں کا دفتر تھی، جس میں
روزان کی اک مسکراہٹ کی حاضری لگتی،
شام کے سایے ان کی نیندوں کا آنگن تھے!
صبح کو ہم اپنے اپنے کاموں پر جاتے، تو اس سبز سڑک کے موڑ پر
تازہ دم پھولوں کے رنگ برنگے تختے ہم سے کہتے،
"کرنوں کا یہ دھن سب کا ہے، سب کا، اس میں
جیو، جیو، سب مل کر! سنگت سے ہے رنگت"
پھر جب ان کی روشنیاں تھکتیں،
تو اس موڑ پہ نیندیں اوڑھ کے سہمے ہوئے وہ پھول یہ ہم سے کہتے،
"سب کا بیری ہے یہ اندھیرا،
جلد اپنے اپنے ایندھنوں سے چھٹے ہوئے سپنوں میں پہنچو
اچھا، کل کو ملیں گے، کل کو کھلیں گے!"
لیکن اب وہ تختے اُجڑ گئے اور اب اس کوٹھی کے دروازے پر چکنی بجری ہے،
اور تھرکتے چمکیلے پہیے ہیں،
صاحب، تم نے تو اتنا بھی نہ دیکھا،
یہ سب پھول تو خوشیاں تھیں، محنت کش خوشیاں،
اور یہ لاکھوں کا حصہ تھیں،
تم نے اتنا بھی نہ سوچا،
اے رے، ہم لوگوں کی راحتِ حق کی خاطر لڑنے والے وکیل جلیل! [14]

مجید امجد کے کلام میں "پہاڑوں کے بیٹے" گستاپو، بارکش، اے ری چڑیا، بہار کی چڑیا، گوشت کی چادر، گداگر، جلسہ، موانست، لاہور میں، ایسے بھی دن، کیلنڈر کی تصویر وغیرہ ایسی کتنی نظمیں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ مجید امجد کو چھوٹی چھوٹی کٹھنائیوں سے بڑی بڑی پہنائیوں والی نظمیں نکالنے کا فن قدرت کی طرف سے بھرپور وسائل کے ساتھ ودیعت ہوا تھا۔ [15] سچی بات یہ ہے کہ مجید امجد قطرے میں دجلہ، ذرے میں سورج اور شکستہ ٹھیکریوں میں جہانِ نو آباد دیکھنے پر قادر تھے۔ ان کے اس ذہنی عمل میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں، یہی وجہ ہے کہ عام سطح کا قاری ان کی نظموں کی گہرائی و گیرائی کا کماحقہ، اندازہ نہیں کر پاتا۔ [16]

مجید امجد نے بڑے بڑے موضوعات پر قلم نہیں اٹھایا اور نہ ہی وہ اپنے دور کے رائج موضوعات میں اُلجھے ہیں ۔ان کے ہاں ایسی نظموں کی تعداد بہت کم ہے، جو اس دور کے کسی اہم مسئلے سے متعلق ہوں ۔ایسی نظموں میں بھی مجید امجد نے اپنے نظریۂ فن سے انحراف نہیں کیا اور نہ ہی ان کے احساس کی سطح کسی نظریے کی پابند نظر آتی ہے بلکہ ہر جگہ انفرادی ردِعمل کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔یہ ردِعمل مجید امجد کے ہاں ان کی ذات کے داخل سے جنم لیتا ہے۔ گویا مجید امجد کی ذات کی داخلی تفہیم سے ان کی شاعری کا حقیقی روپ دیکھا جا سکتا ہے ۔ویسے بھی غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کوئی شاعر جب گرد و پیش کے ماحول کی منظر کشی کر رہا ہوتا ہے تو اس کے فن کا مرکز و محور اس کی ذات ہوتی ہے، جو اسے تخلیقی عمل کے لیے اُکساتی ہے اور پھر شاعر اردگرد کے ماحول سے خام مواد لے کر اپنے فنی شرف و شعور کی مدد سے لافانی اقدار ادب پیدا کرتا ہے ۔مجید امجد کی ذات کے بیرونی پہلوؤں سے تو بہت سے لوگ واقف تھے مگر ان کی روحی شخصیت سے بہت کم لوگ آشنا ۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجید امجد اپنے اندر کے حالات کا کسی کو ساجھی نہیں بنانا چاہتے تھے ۔اس کے باوجود ان کی زندگی کے حالات ، مزاج اور مشاغل کے غائر مطالعے سے ان کی ذات کے باطن میں جھانکنا ناممکن نہیں ہے ۔

مجید امجد کی شاعری میں ان کی ذات ''دُکھ'' کا ایک استعارہ نظر آتی ہے ۔حقیقت میں بھی ان کی زندگی دُکھوں سے عبارت تھی اس میں زمانے کے ناموافق حالات کا ہی ہاتھ نہیں تھا بلکہ ان کی ذاتی زندگی کا بھی بڑا عمل دخل تھا ۔۔دو برس کی عمر میں ان کے والد اور والدہ میں علیحدگی ہوئی تو محرومی اور گھٹن کے ماحول نے ان کی شخصیت پر اداسی اور چُپ کے پہرے بٹھا دیے اور پھر یہ چیزیں مجید امجد کی فصیلِ ذات میں مستقل داخل ہو گئیں ۔محرومی ،اطاعت گزاری اور شرمندگی نے سعادت مندی، شکر گزاری اور تنہائی پسندی ایسی صفات کو جنم دیا اور خود کلامی اس عمل کا منطقی نتیجہ ثابت ہوئی ۔مجید امجد نے ناسازگار حالات میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ۔۱۹۳۴ء میں بی ۔اے کیا تو ملک میں اقتصادی بدحالی کا دور دورہ تھا، سرکاری نوکری نہ ملی تو "عروج " کی ادارت قبول کر لی ۔دوسری جنگِ عظیم کے شروع میں برطانوی سامراج کے خلاف ان کی نظم ''قیصریت'' شائع ہوئی تو یہ ادارت بھی جاتی رہی ۔ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں کچھ عرصہ کلرک رہے ۔اور پھر محکمہ سول سپلائز میں انسپکٹر بھرتی ہوئے ۔زندگی کے دکھوں ،منافقتوں اور سماجی جبر نے بد ابر الجھنوں میں اضافہ کیے رکھا ۔مجید امجد نے ان تمام حالات کا مقابلہ مجہول وضع داری سے کیا ۔اور زندگی کی معنویت اور لغویت جیسے خیالات کو انھوں نے فراری رنگ دینے کے بجائے تخلیقی تحرک کے طور پر استعمال کیا ۔مثلاً مجید امجد کی نظموں سے یہ اقتباسات دیکھیے :

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے غمِ دوراں سے پیے
یہی دو سانس، شبستانِ ابد میں یہی دو بجھتے دیے
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی دو رخنے
یہی جو سلسلہ زندگی فانی ہے
کیا اسی ساعت محرومیِ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیِ ایام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے؟
لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوئے کھلیانوں سے
میرا حصہ یہی میری تہی دامانی ہے؟

جی میں آئی کہ اک بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں اُبلتے ہوئے زہراب سے اک خم بھر کر

دیگِ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامہ لافانی ہے
اسی زہراب سے خم بھر کے پٹخ دوں افقِ دوراں پہ
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پہ
اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو میری روح کے ایوان کی زندانی ہے
اٹھ کے پھیلا دوں انھی اُونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پہ
انھی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پہ
اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں [۱۷]

(نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب)

میری قسمت کے یہ دام چکانے والے
میں تو ان کے دلوں کو پڑھ لیتا ہوں
میں تو ان کی روحوں پر چیچک کے داغوں کو بھی گن لیتا ہوں جب وہ تازہ ہو سے بھر جاتے ہیں
میرے سامنے تو ہے ان کا وجود بس ایک تماشا،
لوگ جو اپنی تدبیروں پر بھولے ہوئے ہیں، [۱۸]

(لوگ یہ)

مجید امجد کی ذات میں ادھوری محبت کی کسک بھی بڑی واضح ہے۔انھوں نے اپنی خالہ کی بیٹی حمیدہ بیگم سے شادی کی مگر نباہ نہ ہو سکنے کے باعث یہ ازدواجی رشتہ محض کاغذی بندھن ہی رہا۔اوپر سے بے اولادی کا زخم ان کی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ گیا۔بیوی جھنگ میں مقیم رہی جب کہ مجید امجد نے زندگی کی آخری سانس بھی ساہی وال میں لی۔البتہ اپنی ہجر زدہ ذات کی محرومی اور حمیدہ بیگم کے باطنی کرب کا احساس انھیں ضرور رہا:

میری مانند، خودنگر، تنہا

یہ صراحی میں پھول نرگس کا
اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی
اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا
میرے نزدیک تیری دوری تھی
کوئی منزل تھی کوئی عالم تھا[19]

اس بیری کی اونچی چوٹی پر وہ سوکھا تنہا پتا
جس کی ہستی کا بیری ہے پت جھڑ کی رت کا ہر جھونکا
جس کو میرے آنسو پوجیں، اس گھر کے خاشاک میں مل کر
جس کو میرے سجدے ترسیں، اس دوارے کی خاک میں مل کر
ہائے! مجھ سے نہ دیکھا جائے، آیا ہوا کا جھونکا آیا
ڈالیاں لرزیں، ٹہنیاں کانپیں، لو، وہ سوکھا پتا ٹوٹا[20]

(سوکھا تنہا پتا)

مجید امجد نے اپنی ذات میں محبت کے خلا کو پر کرنے کے لیے محبتیں بھی کیں، جن کی پرچھائیاں ان کی نظموں شرط، حسن، جوانی کی کہانی، کون؟ سربام، بندا، ایک پرنشاط جلوس کے ساتھ، بفرش خاک، لمحات فانی، التماس اور ریلوے سٹیشن پر وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ایک جرمن سیاح شالاط نامی لڑکی سے ہونے والی محبت ہے۔ شالاط ہڑپہ کے کھنڈر دیکھنے کی غرض سے ساہی وال کے سٹیڈیم ہوٹل میں ٹھہری تھی کہ مجید امجد اسے اپنا دل دے بیٹھے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا: ''شالاط شرق بعید کی سیاحت کے بعد وطن واپس جاتے ہوئے جب پاکستان پہنچی تو ہڑپہ کے کھنڈرات دیکھنے کے لیے بھی گئی، ان کھنڈرات میں تو وہ زندگی کی کوئی لہر نہ دوڑا سکی لیکن اسے کیا خبر تھی کہ ہڑپہ کے قریب ساہیوال شہر میں ایک کھنڈر ایسا بھی تھا جو اس کی پہلی چہکار سے جاگ اُٹھے گا۔۔۔۔۔ یہ کھنڈر مجید امجد تھا''[21] چند ماہ بعد شالاط اپنے ملک چلی گئی اور یوں دیگر محبتوں کی طرح مجید امجد کا یہ تجربہ عشق بھی ادھورا رہا۔ شالاط سے ہونے والی ملاقاتوں میں مجید امجد کے ہاں جنسی عاجزی کا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ شالاط کو الوداع کہنے کے لیے مجید امجد ساہی وال ریلوے سٹیشن گئے مگر کچھ کہنے کی خواہش لیے اس کے ساتھ کوئٹہ پہنچ گئے لیکن پھر بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ شالاط اپنے ملک چلی گئی مگر مجید امجد اس کی یاد کو سینے سے لگائے اپنی جان سے امرت کشید کرتے رہے۔ مجید امجد کی نظموں سے چند مثالیں دیکھیے:

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی گھاٹیوں میں تم
اک لمحہ آ کے ہنس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا
تم پھر نہ آسکو گے، بتانا تو تھا مجھے
تم دور جا کے بس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا
طلوعِ مہر، شگفت سحر، سیاہی شب

تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، تیرا غم
نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے تیرا روپ
پلک جھپکی تو مرے دل کے روبرو تیرا غم [۲۲]

(کوئٹے تک)

بزمِ دوراں سے کیا ملا اُس کو
سیپ کو چوڑیاں، ملایا سے
کینچلی چین کے اک اژدر کی
ٹھیکری اک مہنجو دارو کی

اک نازک بیاض پر، مرا نام
کون سمجھے گا، اس پہیلی کو؟
فاصلوں کی کمند سے آزاد،
میرا دل ہے کہ شہر میونخ ہے
چار سو جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں، [۲۳]

(میونخ)

اک تری یہ بھیجی ہوئی رنگیں تصویر اور میں
روشن کمرا، جگمگ یادیں، نیر بہاتی چاہ
باہر کالی رات کی ساکت جھیل، سیاہ، اتھاہ
ایک کنارے جیون کی رتنار رتوں کے سنگ
تیرا سہانا دیس، برستی برف، کھنکتے ساز
ایک کنارے امرت پیتے، جیتے جگوں کی اوٹ
میری آخری سانس کی دھیمی بے آواز آواز، [۲۴]

(ایک فوٹو)

مجید امجد کے ہاں محبت کی یہ کسک ذاتی حوالے سے نکل کر علامتی پیرایہ اختیار کر گئی تھی۔ مگر یہ علامتیں ماورائی یا مافوق الفطرت عناصر سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان میں عام زندگی کا حسیاتی رنگ پایا جاتا ہے۔ مجید امجد کی نظموں کو وہ بلند، تب میرا دل، ورنہ تیرا وجود، گھور گھٹاؤں، سب کچھ جھکی جھکی ہوئی، زمانوں سے بھی باہر اور اپنے آپ وغیرہ میں یہ انداز دیکھا جا سکتا ہے، مثال کے لیے مجید امجد کی نظم ''آواز کا امرت'' کی چند سطریں دیکھیے:

اک اک روح کے آگے اک دیوار ہے اونچی گلے گلے تک
اک دیوار ہے رمزوروں کی
اس دیوار کے اندر کی جانب جتنا کچھ بھی ہوتا ہے جس کے پاس خزانہ،
اک دردانہ، یا اک تال کھانہ
نقدِ باطن یا کم از کم ___ آب ودانہ [۲۵]

مجید امجد کی ظاہری شخصیت پر کشش نہیں تھی۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: "مجید امجد نہ تو خوش شکل تھے اور نہ ہی خوش گفتار۔ انتہائی لمبا قد اور جسم بے حد دبلا پتلا، بینائی جوانی ہی میں کمزور ہو گئی تھی۔ موٹے موٹے شیشوں والی عینک پہنتے تھے۔ رات کو بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ ان کے گھرانے میں تپ دق کا موذی مرض بھی موجود تھا۔ امجد کے پھیپھڑے بھی متاثر تھے۔" [۲۶] اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کی حیثیت سے نوکری سے ریٹائر ہوئے تو وفات سے ایک ماہ قبل تک پنشن نہ ملنے کے سبب فاقہ کشی جیسے حالات سے واسطہ رہا۔ مجید امجد کے سوانحی حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ زندگی ان کے لیے اک جبرِ مسلسل سے کم نہ تھی۔ محرومیوں اور ناکامیوں کے سبب ان کی ذات میں شکست و ریخت کا عمل آخری دم تک جاری رہا۔ مجید امجد نے اپنی اس شکستہ ذات کو ایک عمارت کے روپ میں دیکھا ہے۔ جس کا کوٹھا کب کا گر چکا ہے، بوسیدہ دیواروں سے پلستر اکھڑ چکا ہے اور چھتیں میلی میلی سی ہیں۔ گویا عدم تحفظ کا احساس روح و جسم پر حاوی ہے۔ "میرے سینے کے اندر اک چھوٹا سا کوٹھا گر پڑتا ہے" جیسے بے شمار مصرعے ان کی شاعری میں نوحے کی فضا کو جنم دیتے ہیں:

آج تو جب سے جاگا ہوں اپنی بابت اتنا کچھ سمجھ سکا ہوں،
کالی گلیوں کی دھوپ اپنے چہرے پر مل کر یہ دنیا والوں سے ملنے والا
مر بھی چکا اب، اپنی نیندوں میں جینے کی خاطر، [۲۷]

(جاگا ہوں تو)

ریزہ ریزہ کرنوں کے انبار کے نیچے
اپنے آپ میں سوچوں
ایسی شامیں تو جگ جگ ہیں
آگے تو جانے کیا کچھ ہے
لیکن ان سب ہوتے امروں کے ریلے میں،
کہیں کسی امکان ـــ ذرا سے اک امکان ـــ کی اوٹ ایسی بھی تو ہو،
جس میں سمٹ سکے، یہ میلی میلی سی چھت،
اور یہ اُترے پلستر والی بوسیدہ دیواریں،
جن کی کھڑکیاں میرے دل کی طرف کھلتی ہیں، [۲۸]

(ان سب لاکھ گروں)

مجید امجد کی ذات کی داخلی تفہیم کے بعد ان کی شاعری میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ امجد نے اپنی ذات اور انسانی

احساسات کے اظہار کے لیے کسی نفسیاتی کیفیت کا سہارا نہیں لیا بلکہ ان کے ہاں ذات کا اظہار زیادہ تر براہ راست طریقے سے ہوا ہے، یا پھر انسانی احساسات کے حوالے سے۔ وہ ایک طرف اپنی ذات کو رکھتے ہیں اور دوسری طرف وسیع کائنات اور اس کے اندر بکھرے ہوئے مظاہر کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور پھر ان مظاہرات کی ہماہمی میں اپنی ذات یا انسانی احساسات کی پامالی کا درد بھرا نغمہ الاپتے ہیں۔ یوں خارجی زندگی کے مظاہرات کو اپنی ذات سے مربوط کر کے اس کا اظہار غیر شخصی طریقے سے کرتے ہیں۔ ذات کے تشخص کی دریافت اور انسانی احساسات کے وسیلے سے کائناتی شعور کا ادراک مجید امجد کی نظموں کو آفاقیت سے ہم کنار کرتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

کھلاڑیوں کے خودنوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر۔۔ حسین لڑکیاں!
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر، حسین لڑکیاں!
میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پا بہ گِل!
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے

یہ لوحِ دل! یہ لوحِ دل!
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے! [۲۹]
(آٹوگراف)

میں نے حسرت بھری نظروں سے تجھے دیکھا ہے
جب تو روز اک نئے بہروپ میں، روز اک نئے انداز کے سات
اپنی ان گاتی ہوئی انگھڑیوں کی چشمک طناز کے سات
روز اک تازہ صنم خانہ آہنگ میں در آتی ہے!
کاش میں بھی وہی اک عکس درخشاں ہوتا
دلِ انساں سے ابھرتی ہوئی موہوم تمناؤں کا عکس
ایک مانگی ہوئی اچکن میں سمایا ہوا اما مو رفغاں شخص
جس کے پہلو میں تری روح دھڑک سکتی ہے [۳۰] (نرگس)

مجید امجد زمانے میں پائے جانے والے جبر و استحصال اور انسانی احساسات کی پامالی کو ایک تہذیبی تسلسل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر چیز میں تبدیلی ممکن ہے، مگر نچلے طبقے کا استحصال ایک نہ بدلنے والی حقیقت ہے۔ یہ استحصال انسان کو اس کے مرتبے

سے بہت نیچے لے جاتا ہے ۔جہاں وہ انسان سے جانوراور نہ جانے کیا کیا روپ دھارلیتا ہے ۔استحصال زدہ طبقے میں غریب بچے، جاروب کش، نانبائی، کوچوان ، پتھرتوڑنے والے ،ہٹی والااور ایسے بے شمار لوگ شامل ہیں ۔اس ہجوم میں وہ اپنی ذات کوبھی بیان کرتے ہیں،جس کا مقدر محرومیاں ہیں،مگروہ مایوسی کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتے ۔بلکہ وہ اس نظام کے خلاف جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں ۔یہ بظاہر فرسودہ نظام کے خلاف ایک فرد کی جدوجہد ہے لیکن اصل میں استحصالی نظام کے خلاف حق وانصاف کی جدوجہد ہے،مگر مجید امجد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے معاشی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے کہیں بھی نظموں کے شعری حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا ۔وہ نظموں میں واقعات ،کرداروں اور مکالموں سے ایک پر اسرار اور جذباتی فضا پیدا کر دیتے ہیں،محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعات کسی مخصوص وقت میں کسی مخصوص مقام پر پیش آئے ہیں، بلکہ نظموں میں موجود مکالمے بھی کسی خاص کردار کی زبان سے نکلے محسوس ہوتے ہیں ۔مگر نظم کا مجموعی تاثر ان کو تعین کی قید سے نکال کر زمان ومکاں کی قید سے ماورئی کردیتا ہے ۔اور پتا چلتا ہے کہ یہ واقعات اور کردار ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں ۔یہ کردار صرف انسانی نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو کسی خوبی کی نشان دہی کرتی نظر آتی ہو ان کے ہاں کردار کی حیثیت رکھتی ہے ۔شجر، بیل ،ہوا،ہنگترہ،پانی ،نرگس روپ کی رانی، دھوپ کا مہین آنچل ،ٹہنیاں ،ہالی ،چولھا، چڑیا، ہری بھری فصلیں ،پھول، لالی ،ریڑھی والااور تانگے والاایسے ان گنت کردار ہیں ،جن سے مجید امجد کی شاعری کا نگارخانہ مزین ہے ۔ اسی لیے ڈاکٹر رشید گوریجہ کا کہنا ہے کہ:

"کسی نے مجید امجد کو اداس لمحوں اور اداس شاموں کا شاعر قرار دیا، کسی نے مجید امجد کی شاعری میں شجر کی اہمیت کو موضوع بنایا ۔حقیقت یہ کہ مجید امجد خواہ اپنی اداس شاموں کا ذکر کر رہا ہو یا ہرے بھرے درختوں کو علامت بنا کر زندگی کے حقائق بیان کر رہا ہو، وہ انسانی جذبات، احساسات اور سماجی تضادات کی تصویریں ہی بنا رہا ہوتا ہے" ۔[۴۱]

مجید امجد ان چیزوں سے کبھی براہ راست مخاطب ہوتے ہیں ،کبھی دوسروں کی توجہ ادھر مبذول کرواتے ہیں ،غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ دراصل وہ زندگی کے کسی دُکھ کو کسی نہ کسی حوالے سے اپنی ذات سے مربوط کر کے اپنے من کی چھاگل میں اتارنے کی سعی کرتے ہیں ،اور پھر اسے لازوال سمجھ کر اس کائنات اور نظام کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں ۔ مجید امجد کی نظموں سے چند مثالیں پیش ہیں:

یہ دھوپ ،جس کا مہین آنچل ،
ہوا سے مس ہے....
رُتوں کا رس ہے
دلوں سے مس ہے،وہ زہر جس میں دکھوں کا رس ہے،
جو ہوسکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل
کبھی ،کبھی ایک بوند اس کی ،کسی نوا میں دیا جلائے
تو وقت کی پینگ جھول جائے [۴۲]

(صاحب کا فروٹ فارم)

میں پیدل تھا، اتنے میں کڑ کا کوئی تازیانہ، بہافرشِ آہن پہ ٹاپوں کا سر پٹ تر یڑا،
کوئی تند لہجے میں گرجا، "ہٹو سامنے سے ہٹو"، اور پر شور پہیے گھناگھن مری سمت جھپٹے،
بہ مشکل سنبھل کر جو دیکھا، کھچاکھچ بھرے تیز تانگے کی مسند پہ، اک صورتِ سگ
لجامِ فرس پہ جھکی تھی!
یہ لطفِ کریمانہ خوشدلاں بھی، یہ پر غیظ خوے سگاں بھی،
مرے ساتھ رو میں ہیں لوگوں کے جتنے رویے، یہ سب کچھ یہ سارے قضیے،
غرض مندیاں ہی غرض مندیاں ہیں، یہی کچھ ہے اس رہگزر پہ متاعِ سواراں،
میں پیدل ہوں، مجھ کو جلوسِ جہاں سے انہی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے، [۴۳]

(جلوسِ جہاں)

میں ترے در پہ، چمکتی چلمنوں کی اوٹ سے
سن رہا ہوں قہقہوں کے دھیمے دھیمے زمزمے
کھنکھناتی پیالیوں کے شور میں ڈوبے ہوئے
گرم، گہری، گفتگو کے سلسلے
مشعلِ آتش بجاں کے متصل
اور ادھر، باہر گلی میں خرقہ پوش و پابہ گِل
میں کہ اک لمحے کا دل
جس کی ہر دھڑکن میں گونجے دو جہاں کی تیرگی
زندگی، اے زندگی [۴۴]

(زندگی، اے زندگی)

انگاروں کا روپ
جیٹھ ہاڑ کی دھوپ
اور اس جلتے سے
مہکیں تیرے سنگ
رنگ رنگ کے رنگ
دیکھ سکے تو دیکھ،
جیون کے یہ لیکھ
لے کر اس جگ میں
سونے کا کشکول

سب اک پل کے مول
اپنے من کی سگندھ
بیچنے آئے ہیں
کیا تو ۔۔۔اور کیا میں ۳۵

(زینا)

مجید امجد کے ہاں وہ تمام کیفیات، واردات اور شعوری تجربے موجود ہیں، جو کسی شاعر کے ہاں داخل اور خارج کے تصادم سے جنم لیتے ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ ہر تجربے کو شعری رنگ دیتے وقت انھوں نے فکر و شعور کی تخلیق گاہ کو حقیقی اور سائنسی پیمانوں پر استوار کیا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی نظم لکھیں اس میں سائنٹیفک اپروچ اور سائنسی صداقت اپنی جگہ نظر آتی ہے ۔بعض نظموں میں تو یوں لگتا ہے جیسے اس نظم کا خالق کوئی ماہر سائنس ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجے کی شعری صلاحیتیں بھی ودیعت کر رکھی ہیں ۔ایسی نظمیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مجید امجد نے اپنے وجدان کو عقل و سائنس سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ان کی نظموں سے ایسے بے شمار حوالے تلاش کیے جا سکتے ہیں، جن سے اس بات کا اندازہ ہو کہ ان کے ہاں شعر و علم میں کوئی تضاد نہیں ہے ۔ان کی نظموں سے کچھ حصے دیکھیے جن میں شعری حسن کے ساتھ ساتھ سائنسی صداقتیں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں:

تم کیا جانو، مجھ سے پوچھو، میں اس مٹی کی سوکھی پتلی تہ پر کھیلا ہوں
اس مٹی کی تہ کے نیچے گدلا گاڑھا گہرا پانی ہے سیلانی سیلابوں کا
پھر وہ دن بھی تھے کچھ بڑے الیلے اور تب علم بھی مجھ کو نہ تھا ان دنوں کا جب ہر ذرہ سورج بن جاتا ہے ۳۶

(تم کیا جانو)

ساتوں آسمانوں کے عکس اور کنکر آ آ کر گرتے ہیں خیالوں کے خانوں میں
یہ سب کچھ ان الگ الگ خانوں میں، اک وہ یکجا مخفی قوت ہے، جو
مجھ پر ظاہر تو نہیں لیکن جو یوں ہونے میں میری ہونی کے ساتھ ہے ۳۷

(ساتوں آسمانوں)

آج کہاں ہیں ______ یہ سب لوگ
اب تو ان کی بو تک بھی،
شہر ابد کے تہ خانوں سے نہیں آتی،
باقی کیا ہے،... صرف
سورج کی اک چنگاری....
اور اس چنگاری کے دل میں دھڑکنے والی کلی،
جس کی ہر پتی کا ماس،
فرد......!

عصر......!

حیات.....![۴۸]

(مسلخ)

مجید امجد نے کائنات کے معمولی سے معمولی واقعے سے وہ عظمت تلاش کی، جس پر عام آدمی کی نظر نہیں جاتی، پھر انھوں نے ماحول اور ذات میں تطبیق پیدا کر کے اس کو اپنی روح کے دہکتے الاؤ میں ڈھال کر شعری پیکر عطا کیا اور اپنی شعری کائنات کو وسعت بخشی۔ جذبوں کی صداقت، فکر و خیال کی پاکیزگی اور ذات کے ترفع نے مجید امجد کی شاعری کو اس مقام سے آشنا کیا، جو بہت کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔

حواشی:

۱۔ مجید امجد: ''کلیاتِ مجید امجد'' لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۸، ۳۰۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۳۔ یہ ملاقات جعفر شیرازی کے گھر اُردو روڈ، فرید ٹاؤن، ساہی وال میں ۱۵ اپریل ۱۹۹۱ء کو ہوئی۔

۴۔ بلراج کومل: ''مجید امجد۔ ایک مطالعہ'' مشمولہ ''گلاب کے پھول'' مرتب، محمد حیات سیال، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۸ء، ص ۱۳۶

۵۔ محمد زکریا، خواجہ: ''مجید امجد اور آزاد نظم'' مشمولہ ''مجید امجد۔ ایک مطالعہ'' مرتب، حکمت ادیب، جھنگ: جھنگ ادبی اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۰

۶۔ ''گلاب کے پھول'' مرتب، محمد حیات سیال، ص ۱۳۶

۷۔ ''مجید امجد سے ایک انٹرویو'' مشمولہ ''گلاب کے پھول''، ص ۳۲۔۳۳

۸۔ مجید امجد ''کلیاتِ مجید امجد''، ص ۱۹۶

۹۔ محمد زکریا، خواجہ: پیش لفظ ''ان گنت سورج'' لاہور: ضیائے ادب، ۱۹۷۹ء

۱۰۔ عامر سہیل، سید: ''مجید امجد۔ بیاضِ آرزو بکف''، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۵ء، ص ۷۵

۱۱۔ محمد زکریا، خواجہ: ''مجید امجد کے ہاں ہیئتوں کا مطالعہ'' مشمولہ ماہنامہ ''محفل'' لاہور، شمارہ، جولائی ۱۹۹۱ء، ص ۷۷

۱۲۔ ذوالفقار احمد تابش: ''کھلی آنکھوں والا شاعر'' مشمولہ ماہنامہ ''فنون'' شمارہ مئی جون ۱۹۷۵ء، ص ۳۷

۱۳۔ مجید امجد: ''کلیاتِ مجید امجد''، ص ۴۱۴۔۴۱۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۷۳۔۵۷۴

۱۵۔ ناصر شہزاد: ''کون دیس گیو''، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۶

۱۶۔ تقی الدین انجم: ''تعارف'' مشمولہ ''گلاب کے پھول''، ص ۹۱

۱۷۔ مجید امجد: ''کلیاتِ مجید امجد''، ص ۲۵۷۔۲۶۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۸۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۸۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۲۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''مجید امجد کی داستانِ محبت''، لاہور: معین اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص ۹۴

۲۲۔ مجید امجد: ’’کلیات مجید امجد‘‘، ص ۳۱۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۱۹۔۳۲۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۳۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۶۷

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۸۴

۲۸۔ ایضاً، ۵۸۶

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔۲۷۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۷۹۔۲۸۰

۳۱۔ ’’مجید امجد کی نظمیں یا اوراقِ مصور‘‘ مشمولہ ’’مجید امجد۔ ایک مطالعہ‘‘ مرتبہ حکمت ادیب جھنگ: جھنگ ادبی اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص ۵۶۶

۳۲۔ مجید امجد: ’’کلیات مجید امجد‘‘، ص ۳۷۶۔۳۷۷

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۱۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۴۲۔۴۴۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۳۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۶۴۱

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۵۱

نواب شیخ غلام محبوب سبحانی اور انجمنِ پنجاب اور انجمنِ اتحاد کے مشاعرے

پروفیسر محمد حنیف شاہد

اردو زباں کا مرکز لاہور بن گیا ہے   دہلی و لکھنو کو پکارا کرے کوئی[1] (صفدر مرزاپوری (لکھنو)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دہلی کے آسمانِ ادب سے چند ٹوٹے ہوئے ستارے گردشِ روزگار کے ہاتھوں لاہور پہنچے۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور شہزادہ مرزا ارشد گورگانی کو اردو بولتے سنا، اور دوسری پشت اور نسل میں ہمارے ہاں جو لوگ پیدا ہوئے ان میں شیخ عبدالقادر، علامہ محمد اقبال، مولانا ظفر علی خان، چودھری خوشی محمد ناظر، میر سید غلام بھیک نیرنگ میاں محمد شاہ دین ہمایوں، مولوی انشاء اللہ خاں، مولوی محبوب عالم، خاں احمد حسین خاں، مولوی محرم علی چشتی اور منشی محمد دین فوق کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ یہ بزرگ اس وقت بھی کمال فن کے اعتبار سے خداوندانِ سخن تھے اور آج بھی اس میدانِ علم و ادب میں ان کا کوئی شریک اور ثانی نظر نہیں آتا۔

اس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مرزا ارشد گورگانی دہلوی، میر ناظر حسین ناظم لکھنوی، منشی الٰہی بخش رفیق اور ان کے شاگردوں کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں شاعری کا کچھ کچھ چرچا ہونے لگا تھا مگر:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ تھے

ان بزرگوں سے کچھ پہلے مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی اردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوشش کر چکے تھے۔ انھوں نے کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ایماء پر ۱۸۷۴ء میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کے بجائے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا اور مشاعرے میں شعراء اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس پر طبع آزمائی کرتے۔ یہ مشاعرے ''انجمن پنجاب'' کے دفتر میں بڑی آن اور شان سے ہوتے تھے۔ دراصل اس زمانے کا لاہور آج کے لاہور سے مختلف تھا جہاں علم کے دریا بہہ رہے تھے اور زمانے بھر کے اہل علم و فضل ادیب اور شاعر سمٹ کر اس میں جمع ہو گئے تھے۔ اس وقت کے لاہور کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی جیسے سنجیدہ، متین، خاموش اور بے نفس انسان کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

رہے لاہور میں آ کر، سو جانے
یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل باشائے چمن ہے

اوراسی بناپر مولانا الطاف حسین حالی نے ۱۸۷۵ء کے شروع میں اپنا تبادلہ اینگلوعربک سکول دہلی میں کرالیا تھا۔ان کے لاہور سے چلے جانے کے بعد مشاعروں کا سلسلہ تو بند ہوگیا البتہ مولانا محمد حسین آزادؔ برابراپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے اوران کی توجہ اورآبیاری سے پنجاب میں اردو کا باغ آہستہ آہستہ پھل پھول لاتا رہا۔مولانا الطاف حسین حالیؔ اورمولانا محمد حسین آزادؔ کا نام تو سررشتہ تعلیم پنجاب کی نصابی کتب کے ذریعے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا مگر دوسرے بزرگوں کو زود فراموش زمانے نے فراموش کردیا۔[۲]

اس مختصر سے تعارف کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔سب سے پہلے ہم شیخ غلام محبوب سبحانی کا شجرہ نسب پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہوجائے کہ شیخ صاحب موصوف کس خاندان کے چشم وچراغ تھے:

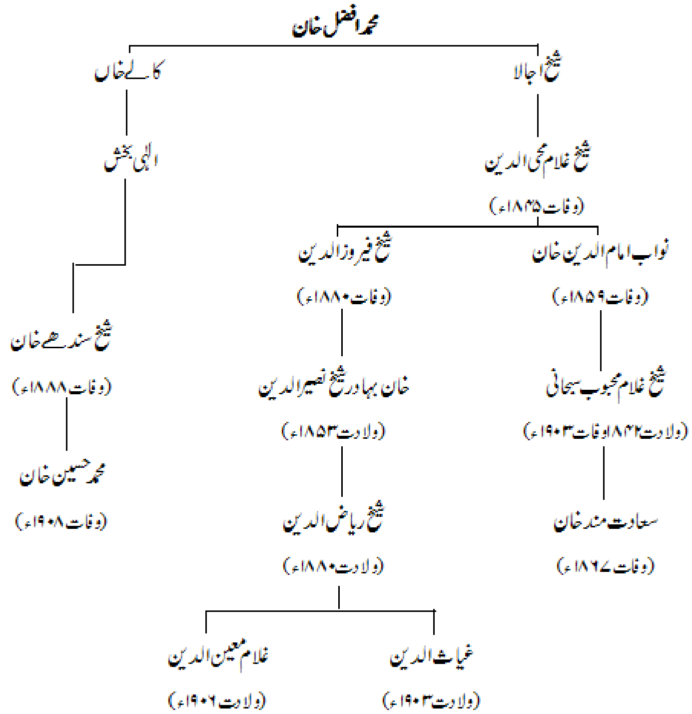

شیخ اجالا ذات کے کلال اور سردار بھوپ سنگھ رئیس ہوشیار پور کے ہاں منشی تھے۔ ان کے صاحبزادے غلام محی الدین جو ابھی بچے ہی تھے معروف جنرل مکھم چند کے بیٹے دیوان موتی رام کے منظورِ نظر ہو گئے۔ جنھوں نے انھیں اپنے دوسرے بیٹے شیو دیال کا مصاحب بنا دیا۔ اس عہدے پر وہ جلد ہی ایک مقتدر آدمی بن گئے اور شیو دیال کے تمام کاروبار کے وہی مہتمم تھے۔ ۱۸۲۳ء میں غلام محی الدین نے مہاراجا رنجیت سنگھ کو محمد عظیم خان والیِ کابل کے خلاف لڑنے اور پشاور پر قبضہ کرنے میں بہت مدد دی اور غلام محی الدین پشاور میں سفیر بنا دیے گئے۔ ۱۸۲۷ء میں جب کرپا رام کشمیر کا گورنر بنا تو غلام محی الدین اپنے مربی کے ہمراہ کشمیر چلا گیا اور کرپا رام کے کاروبار کا مختارِ کل ہو گیا لیکن ۱۸۳۱ء میں اسے واپس لاہور بلا لیا گیا مگر اسی سال یہ شہزادہ شیر سنگھ کا جو کرپا رام کی جگہ کشمیر میں مامور کیا گیا تھا کارندہ اور نائب ہو کر کشمیر چلے گئے۔ شہزادے کو کام کی کچھ خبر نہ تھی اس لیے شیخ غلام محی الدین کو اب ہمیشہ سے زیادہ طاقت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۳۲ء میں کشمیر میں قحط پڑا تو انھیں واپس لاہور آنا پڑا۔ روایت ہے کہ اس وقت تک اپنی جائیداد کے علاوہ ساڑھے نو لاکھ روپے جمع کر چکے تھے۔

کچھ عرصہ بعد شیخ غلام محی الدین شہزادہ نونہال سنگھ کی خدمت میں مامور ہو گئے اور بہت جلد اس کے منظورِ نظر ہو گئے، یہ شہزادے کے ہمرکاب پشاور گئے اور مال کے وزیرِ اعلیٰ مقرر رہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں انھیں دوآبہ جالندھر کا ناظم بنا دیا گیا جب ۱۷ اپریل ۱۸۴۱ء کو میہاں سنگھ ناظم کشمیر مارا گیا تو شیخ غلام محی الدین اس کے جانشین مقرر ہو گئے اور فوراً کشمیر روانہ ہو گئے اور ان کے بیٹے امام الدین خاں کو دوابہ جالندھر کی نظامت کا اختیار منڈی سے بلا کر دے دیا گیا۔

دونوں شیخوں (اس نام سے دونوں باپ اور بیٹا مشہور تھے) نے اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ فروری ۱۸۴۵ء میں شیخ غلام محی الدین نے سرکار انگریزی سے خط و کتابت کرنے کی کوشش کی جس کے ساتھ انھوں نے اپنی طرف سے اور راجا رحیم اللہ خاں رئیس راجوڑی کی طرف سے اطاعت قبول کی مگر سرکار انگریزی نے اس درخواست کو نامنظور کیا۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا (کہا جاتا ہے کہ انھیں زہر دے دیا گیا تھا) چناں چہ ان کے بیٹے امام الدین خان کو کشمیر میں ان کی جگہ ناظم بنا دیا گیا۔ دونوں باپ بیٹا مالیہ وغیرہ وصول کرنے میں نہایت سخت تھے اور حکومت کے نمک خوار تھے۔

جب کشمیر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو عہد نامے کے مطابق مہاراجا گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا تو امام الدین خان وہاں کا ناظم تھا۔ کشمیر کا اس طرح دیا جانا لاہور میں کسی کو پسند نہ تھا اور وزیر راجا لال سنگھ کو خاص کر ناگوار تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ گلاب سنگھ ہمیشہ اس کا حریف اور دشمن رہا تھا، چناں چہ اس نے امام الدین خان کو تاکید کر دی کہ مہاراجا کی مخالفت کرے اور فوج کو یہ ہدایت کی کہ بلا عذر شیخ امام الدین خاں کا حکم مانے۔ امام الدین خان اس حکم کی تعمیل کرنے کے لیے خوب مستعد تھا، وہ بڑا متمول آدمی تھا۔ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق ان کے پاس ستر (۷۰) لاکھ روپے اور ایک روایت کے مطابق دو کروڑ روپیہ تھا۔ یہ یقینی بات ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں نے ایامِ نظامتِ کشمیر میں اور دوابہ جالندھر میں وافر اور کثیر تعداد میں دولت جمع کی تھی۔

امام الدین خاں سرکار کا خیر خواہ اور نمک خوار رہا۔ جون ۱۸۴۸ء میں دو ہزار آدمیوں کی نئی بھرتی شدہ فوج کے ساتھ کوچ کر کے وہ لیفٹیننٹ سر ہربرٹ ایڈورڈز کی فوج کے ساتھ جا ملا۔ خود اس نے اور اس کی فوج نے اچھی خدمات انجام دیں اور باغیوں کے

ہمراہ کئی لڑائیوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ جب امن وامان ہو گیا تو انھی خدمات کے صلے میں انھیں ''نواب'' کا خطاب ملا اور گیارہ ہزار چھ سو روپے کی نقد پنشن حینِ حیات عطا کی گئی، نیز ان کی آٹھ ہزار چار سو روپے کی جاگیر مستقل طور پر ان کے نام کر دی گئی۔ ۱۸۵۷ء میں سرکار کے حکم کے مطابق انھوں نے دہلی میں خدمات کے لیے رسالے کے دو دستے بھرتی کیے۔ وہ چالیس سال کی عمر میں مارچ ۱۸۵۹ء میں ایک صاحبزادہ شیخ غلام محبوب سبحانی چھوڑ کر فوت ہوئے۔

۱۸۶۲ء میں پنجاب گورنمنٹ کی سفارش پر گورنمنٹ عالیہ نے شیخ غلام محبوب سبحانی کی جاگیر میں سے پانچ ہزار چھ سو روپے کی جاگیر دوامی اور باقی دو ہزار آٹھ سو روپے کی جاگیر تاحینِ حیات واگزار کر دی۔ شیخ غلام محبوب سبحانی نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لاہور میں گزارا۔ گرفن کا کہنا ہے کہ ''وہ عوام الناس کے کام میں کبھی حصہ نہیں لیتے تھے۔'' (یہ بات حقیقت کے برعکس ہے اور غلط بیانی پر مبنی ہے)۔

۱۹۰۳ء میں بمقام دہلی ''دربار تاج پوشی'' کے موقع پر جس میں شامل ہونے کے لیے سرکار نے انھیں مدعو کیا تھا، فوت ہوئے ...... انھوں نے کوئی جائز وارث نہیں چھوڑا۔ گرفن کا بیان ہے کہ ان کی ایک لڑکی تھی اور سرکار سے بارہ سو روپے سالانہ پنشن وصول کرتی تھی، لیکن یہ درست نہیں۔ شیخ غلام محبوب کی لڑکی نہیں ہمشیرہ تھی جو سو روپے ماہوار پنشن پاتی تھی۔ بعد ازاں اس کی جاگیر سرکار نے ضبط کر لی۔ شیخ غلام محبوب سبحانی کے چچیرے بھائی شیخ نصیر الدین نے ان کی ذاتی جائیداد ورثہ میں پائی۔ وہ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ پنجاب میں ایکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ کمشنر تھے اور تقریباً تین سال تک ریاست بہاول پور میں وزیر رہے۔ ریاست کے اس عہدے پر ان سے پہلے ان کے والد شیخ فیروز الدین مامور تھے۔ یکم جنوری ۱۹۰۹ء کو شیخ نصیر الدین کو ''خان بہادر'' کا خطاب عطا ہوا۔ شیخ فیروز الدین ۱۸۶۶ء میں تحصیل دار مقرر ہوئے۔ پانچ سال بعد ان کی تبدیلی ریاست بہاول پور میں کر دی گئی جہاں وہ منچن آباد میں کلکٹر مقرر ہوئے اور چند ہی سال میں وہ سیشن جج ہو گئے۔ ۱۸۷۸ء میں وہ آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ انھوں نے ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔[۳]

اسے حسنِ اتفاق کہیے یا خوش قسمتی کہ ''جوئندہ یابندہ'' کے مصداق ہمیں مولوی فیروز الدین مرحوم کی تصنیف ''یادگار دربار'' مل گئی جس میں کچھ ایسی معلومات درج ہیں جو مذکورہ بالا مندرجات میں موجود نہیں۔ ان تازہ معلومات سے ہمارا مطلب کلی طور پر تو پورا نہیں ہوتا لیکن نواب صاحب کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ آپ بھی ان معلومات سے استفادہ فرمائیے۔

''نواب شیخ غلام محبوب سبحانی جاگیر دار اور رئیس لاہور گورنمنٹ برطانیہ کے درباری مہمان تھے مگر افسوس کہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی آپ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نواب صاحب مرحوم چوں کہ شہر کے ایک نامور خاندان کے خاتم ہوئے ہیں اس لیے بطور یادگار ان کا مختصر سا خاندانی حال پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نواب صاحب مرحوم کے دادا شیخ غلام محی الدین صاحب مرحوم بعہد مہاراجا رنجیت سنگھ والیِ پنجاب، کشمیر اور دوابہ جالندھر و ہوشیار پور وغیرہ کے ناظم اور صوبے دار رہ چکے ہیں جن کو سکھ سرکار سے ''نظام الملک اعتماد الدولہ'' کا خطاب بھی حاصل تھا۔ اور ایک بار کابل میں سفیر ہو کر بھی گئے تھے۔ بعد ازاں ان کے خلف الرشید نواب شیخ امام الدین خان بھی سکھ سرکار میں انھیں علاقہ جات کے

صوبہ دار اور گورنر رہے۔ اور کوہستان منڈی اور ڈیرہ اسماعیل خان کے بھی ناظم بنائے گئے اور جنگی فوج کے بھی افسر مقرر ہوئے جس کے باعث انھیں ''امین الملک جنگ بہادر'' کا خطاب بھی ملا۔ ۱۸۴۷ء میں گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے دیوان مولراج صوبہ دار ملتان کے خلاف جنگ کرنے کی وجہ سے نمایاں خدمات کے صلہ میں نواب بہادر بنائے جانے کے بعد پنشن حاصل کرتے ہی ۱۸۵۷ء کے غدر (جنگ آزادی) میں دو دستے جنگی فوج کے اپنی گرہ سے مہیا کر کے گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیے۔ ۱۸۵۹ء میں نواب صاحب کے انتقال کرنے پر ان کے خلف الصدق نواب شیخ غلام محبوب سبحانی جو ۱۸۴۵ء کی پیدائش ہیں چودہ برس کی عمر میں جائیداد متروکہ کے جس کی آمدنی قریباً ۲۰ ہزار روپے سالانہ کی تھی جائز وارث قرار پائے۔

آپ نے فارسی اور عربی علوم میں اعلیٰ درجہ کی قابلیت پیدا کر کے خاص شہرت حاصل کی۔ شعر و سخن کے ساتھ آپ کو خاص دلچسپی تھی چناں چہ فارسی میں اپنا ایک عمدہ دیوان اعلیٰ اہتمام کے ساتھ چھپوا کر احباب میں مفت تقسیم کیا۔ آپ انجمن مشاعرہ لاہور کے صدر ہونے کے علاوہ آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے اور کوئی لوکل انجمن ایسی نہ تھی جس نے آپ کی فیاضی سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔

آپ نے جوبلی، ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر اظہارِ مسرت کے جلسوں میں ہزاروں روپے خرچ کیے اور خاص کر جشن تاج پوشی لنڈن کے موقع پر روسا اور حکام کو ایک عالی شان گارڈن پارٹی دی۔ آپ کے عم زاد بھائی شیخ نصیر الدین ڈسٹرکٹ جج شاہ پور، جو اعلیٰ علمی قابلیت کے علاوہ اخلاقِ حسنہ میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں، نواب غلام محبوب سبحانی کے خاندان کے وارث قرار پائے۔''[۱۳ الف]

نواب شیخ غلام محبوب سبحانی کے خاندانی کوائف کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نواب صاحب موصوف بلاشبہ ''نواب ابن نواب'' تھے اور نواب امام الدین (ولادت ۱۸۵۹ء) سابق گورنر کشمیر کے خلف الرشید تھے، ایک معروف جاگیردار اور رئیس لاہور تھے۔ آپ کے خاندانی حالات سے کہیں مترشح نہیں ہوتا اور یہ ذکر نہیں ملتا کہ آپ کی تعلیم کب اور کہاں ہوئی؟ اور آپ نے کن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ ہمیں ان کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہوئی ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ اردو، فارسی اور عربی کے ایک جید عالم تھے اور صاحبِ دیوان بھی تھے۔ ہمیں جو معلومات ان کے بارے میں دستیاب ہوئی ہیں ان کے کئی ماخذ ہیں لیکن ان کی علمی اور ادبی مصروفیات اور مشاغل کا دو حوالوں سے علم ہوتا ہے۔ اول انجمن پنجاب کے گلدستے اور رسائل جن میں مشاعروں کی تفاصیل درج ہیں۔ دوم: ''حیاتِ اقبالؒ کی گمشدہ کڑیاں'' لیکن خوش قسمتی سے ہمیں ''یادگارِ دربار'' بھی دستیاب ہو گیا جس کا قبل ازیں تذکرہ ہو گیا ہے۔

انجمنِ پنجاب لاہور کا قیام ۲۱ جنوری ۱۹۶۵ء کو عمل میں آیا اور ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹر (ولادت: ۱۱۴ کتوبر ۱۸۴۰ء اور وفات ۲۲ مارچ ۱۸۹۹ء) اس کے بانی، صدر اور روحِ رواں تھے۔ آپ جامع حیثیات تھے[۱۴] محقق، ماہر لسانیات، ماہر تعلیم، ایک ممتاز مستشرق، ادیب، دانشور اور ایڈیٹر، مفکر ایک عالم باعمل اور اولوالعزم شخصیت۔ ہمیں انجمنِ پنجاب لاہور کے متعدد اور مختلف گلدستوں اور رسالوں سے جو معلومات حاصل ہوئی اور خصوصی طور پر جن ممتاز اور نامور شخصیات کا پتا چلا ہے ان میں نواب عبد المجید خان، فقیر سید شمس الدین،

شیخ نصیرالدین، فقیر سید قمرالدین، فقیر سید حفیظ الدین، سید رضا شاہ، حکیم غلام مصطفیٰ شاہ، نواب نوازش علی خاں قزلباش، فقیر سید جمال الدین، مولوی علمدار حسین، خان بہادر محمد برکت علی خاں، نواب شیخ غلام محبوب سبحانی، سید ہادی حسین، فقیر سید رکن الدین، کرنل نورالدین، نواب احمد یار خان دولتانہ، فقیر سید شجاع الدین، نواب احمد علی خاں، نواب ناصر علی خان، مولوی عمرالدین، خلیفہ حمید الدین، فقیر سید برہان الدین، ڈپٹی محمد حیات خان، فقیر سید ظفر الدین، میرزا علاءالدین احمد خان، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں انجمن پنجاب لاہور کے زیر اہتمام وانصرام جو انتظامی اور علمی وادبی اجلاس منعقد ہوتے تھے ان میں ممتاز اہل علم ودانش شریک ہوتے جن میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، سید محمد لطیف، ڈاکٹر امیر شاہ، ڈاکٹر محمود حسین، پیرزادہ محمد حسین، خلیفہ حمید الدین، مولوی عبدالحکیم، میر نثار علی شہرت ذکر کیے جانے کے لائق ہیں۔

جہاں تک انجمن پنجاب لاہور (قیام ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء) اور مشاہیر کا تعلق ہے، انجمن مشاعرہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو قائم ہوئی۔[۵] ان مشاعروں میں اردو اور فارسی کی جو غزلیں پڑھی جاتیں انھیں رسالہ انجمن مشاعرہ بیت العلوم پنجاب المعروف بہ ''گلدستہ انجمن'' میں شائع کیا جاتا تھا۔ یہ ''گلدستۂ انجمن'' بالکل علیحدہ ہوتا تھا اور اس میں صرف ''غزلیں'' شائع ہوتی تھیں۔ ان گلدستوں کا اخبار انجمن کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ دو گلدستے (نمبر ۱۵ اور نمبر ۷) پنجاب پبلک لائبریری لاہور اور تین گلدستے (نمبر ۴، ۱۵ اور ۶) پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں جن سے ہم نے ۱۹۷۲ء میں استفادہ کیا تھا، موجود تھے، معلوم نہیں اب یہ مآخذ ان کتب خانوں میں موجود ہیں یا نہیں؟ گلدستہ نمبر ۴، ۴ مارچ ۱۸۸۰ کا ہے جس سے انجمن مشاعرہ کے قیام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ گلدستے ماہوار اشاعت پذیر ہوتے تھے۔

اسی طرح انجمن پنجاب لاہور کے ''طرحی مشاعروں'' کی غزلیں ''گلدستۂ انجمن'' نامی رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ مئی ۱۸۸۳ء تا ستمبر ۱۸۸۳ء کا گلدستہ راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے۔[۵]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو انجمن پنجاب لاہور کا ایک اجلاس صدر انجمن ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر (G.W.Leitner) کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوا جس میں مولانا محمد حسین آزاد سیکرٹری انجمن نے یہ تجویز پیش کی کہ:

''اگر ایک چھاپہ خانہ انجمن پنجاب لاہور کے زیر انتظام اور انصرام قائم کیا جائے تو گلدستوں، رسالہ جات اور کتب کی چھپائی کے لیے بہت سہولت اور فائدہ کا باعث ہوگا''۔ چناں چہ مولانا آزاد کی تجویز کو تائید حاصل ہوئی اور رسالہ جات انجمن اور مطبوعات انجمن کی اشاعت کے لیے ایک مطبع کا قیام عمل میں آ گیا اور جب ''انجمن مشاعرہ'' قائم ہوئی تو مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں گلدستوں کی شکل میں ''مطبع انجمن پنجاب'' ہی سے چھپنے لگیں۔ ان گلدستوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر مطبع انجمن پنجاب سے بے شمار مطبوعات زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوتے تھے اور ان میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں انھیں الگ ''گلدستۂ سخن'' اور ''گلدستۂ انجمن'' کی صورت میں شائع کیا جاتا تھا۔''[۷]

مشاعرہ نعتیہ لاہور

(الشعراء تلامیذ الرحمٰن)

یہ مشاعرہ جامع مسجد نواب وزیر خاں لاہور میں منعقد ہوتا تھا۔ جائے مشاعرہ نعتیہ مسجد مذکور کے مین گیٹ (صدر دروازے) کے سامنے والے فوارے کی دائیں جانب انعقاد پاتا تھا۔اس مشاعرہ کے بانی میاں حکیم امام الدین المعروف حکیم مدح خوان رسول کریم ﷺ تھے۔اس سے پہلے لاہور میں مشاعرے انعقاد پذیر نہ ہوتے تھے چناں چہ نعتیہ مشاعروں کے انعقاد کا سہرا حکیم موصوف کے سر ہے۔حکیم صاحب موصوف اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

"مدت سے بندہ کے دل میں آنحضرت ﷺ کی ثنا خوانی اور نعت گوئی کا شوق تھا۔اکثر مجالس میں اپنے دلی ذوق اور جانی شوق سے نعتیہ اشعار پڑھا کرتا تھا،چوں کہ اس سے پہلے لاہور بلکہ کسی شہر میں نعتیہ مشاعرے کی مجلس منعقد نہیں ہوتی تھی اس واسطے بندہ نے چاہا کہ یہ مبارک مجلس،جس سے دین و دنیا کا ثواب حاصل ہے،لاہور میں منعقد ہوا کرے۔اس ارادے کے پیش نظر شعرائے نامدار اور شائقین بلند اقتدار کی خدمت میں عرض کی۔انھوں نے بندہ کی التماس کو بکمال عنایت مانا اور ماہ رجب ۱۲۹۲ھ سے اس مجلس مبارک کا انعقاد شروع ہوا اور ہر ماہ دو مجلسیں ہوتی رہیں۔چناں چہ پانچ مشاعروں کا یہ مجموعہ جمع ہو کر اہل توفیق حضرات کی امداد سے زیور انطباع پا کر شعرائے عظام اور شائقین کرام کی خدمت میں پیش کش،خدائے تعالیٰ بندہ کو اور ان حضرات کو جو باعث ظہور اس کار خیر کے ہیں جزائے خیر دے۔"[۸]

مولوی عطاء اللہ نے نعتیہ مشاعرہ لاہور کا قطعہ تاریخ لکھا جو قارئین کرام اور حضور اکرم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے فدائیوں اور امت مسلمہ کے عقیدت مندوں اور پرستاروں کی نذر ہے:

مرتب نعت کا ہو کر صحیفا — بنام ایزد لطافت کا لطیفہ
۱۲۹۳ھ
لکھا تاریخ میں اس کی عطاء نے — ہوئی مطبوع دل نعت شریفا

اور مفتی غلام صفدر فوقانی لاہوری نے حسب ذیل قطعہ تاریخ قلم بند فرمایا:

نسخۂ مدح ہی ہے یہ کتاب — ہے یہ دیوان ثنائے احمدی
۱۲۹۳ھ
طرفہ فوقانی نے پئے تاریخ طبع — لکھ چھپا اب مخزن نعت نبیؐ

دعائے خاتمہ

ازمیاں امام الدین بانیِ مشاعرہ نعتیہ لاہور

شکر ہے اب خدائے اکبر کا — ختم پر یہ مشاعرہ پہنچا
دوستوں کی مراد بر آئی — ہوئے خورسند دین کے بھائی

جس نے ہے یہ مشاعرہ دیکھا — بولا اخلاص دل سے صل علیٰ
نور دل سب کا بڑھ گیا اس سے — ہو گیا آئینہ صفا اس سے
ہے یہ بے شک رسولؐ کی تعریف — خاتم المرسلین کی ہے تعریف
دین و دنیا کا جو کہ سائل ہو — اس کو چاہیے اس پہ مائل ہو
اے خداوند خالق دو جہاں — اے شہنشاہ ملک کون و مکان
شاعروں کو سدا سلامت رکھ — نامور ان کو تا قیامت رکھ
اور جو شائق ہیں ان کو رکھ خوشنود — کر عطا ان کو سود اور بہبود
اور جو سنتے ہیں نعت پیغمبرؐ — ان کا مطلب انھیں عطا کر
مانگتا ہے تجھ سے بصدق ویقیں — بندہ کمترین امام الدین

یہ مشاعرہ نعتیہ میاں امام الدین کے اہتمام سے مطبع خورشید عالم لاہور سے ۱۲۹۳ھ اشاعت پذیر ہوا۔[9]

نعت

مشاعرہ سوم

نگاہ لطف کن بر حال زارم یا رسول اللہؐ — کہ جز ذات تو ملجائے ندارم یا رسول اللہؐ
چناں درآب وخاک وخویش از روزازل ہردم — ہوائی آتش عشق تو دارم یا رسول اللہؐ
کہ افتد بعد صد سال از وفاتم دورہ یثرب — صبا بر دارد از مشت غبارم یا رسول اللہؐ
سگ درگاہ پاکت گر قدم برگورم اندازد — شود اکسیر ایں خاک مزارم یا رسول اللہؐ
نمودم قصد درگاہ تو صدبار از نیاز دل — ولی از فرط عصیاں شرمسارم یا رسول اللہؐ
ز سرتا پا اگرچہ غرق بحر درد و عصیانم — ولی بر لطف تو امیدوارم یا رسول اللہؐ
زبان من فشاند گوہر و یاقوت ولعل و دُر — چو محبوبؔ از سر مدح تو دارم یا رسول اللہؐ[10]

مشاعرہ سوم میں جن شعرا نے شرکت فرمائی ان میں مندرجہ شخصیات شامل تھیں:

نواب شیخ غلام محبوب سبحانی تخلص محبوبؔ، شجاع الدین شجاع، مفتی غلام سرور سرور، مفتی امام بخش مفتی، مولوی محمد الدین فوق، شیخ الٰہی بخش رفیق، مولوی عطاء اللہ عطا، محمد یاسین شاہ عاشق، مرزا رستم علی مرزا، سید فیض علی جعفریؔ محمد چراغ الدین لائقؔ، چراغ الدین چراغؔ، میاں ظریف ظریفؔ، غلام احمد پشاوری غلامیؔ، حکیم شجاع الدین شجاعؔ اور نا راچند تارا۔[11]

نعت

مشاعرہ چہارم

ای ز فیض نسبت دارد شرف پیغمبری ‎ ‎ ‎ وی ز فخر نام پاکت انبیا را برتری
مور درگاہت سلیمان را نیارد در خیال ‎ ‎ ‎ خاکروب آستانت کی کند اسکندری
حاجیانت ہر زمال کرد بیاں بہ آستاں ‎ ‎ ‎ حاضر انت انبیا ہر دم پئے خدمت گری
گر ضیائے ذرہ در گاہ پاکت، بنگرد ‎ ‎ ‎ خیرہ و بے نور گردد چشم مہر خاوری
جلوۂ از سایہ دیوارت اربیند کسے ‎ ‎ ‎ نور مہر و ماہ را ہرگز نباشد مشتری
گر ز لطف امراماں را عام سازی در جہاں ‎ ‎ ‎ میش و موش اندر کنار گرگ و گربہ پروری
ذات حق ہمتا نمے دارد و لیکن میکند ‎ ‎ ‎ عاشق روئے تو در عشق تو با حق ہمسری
ذات تو حادث بصورت ہست و در معنی قدیم ‎ ‎ ‎ زانکہ خاصی ایزدی و عین رب اکبری
در ثنائے تو چہ بہ گویم کہ غیر از ذات حق ‎ ‎ ‎ نسبت ذاتت وہم باہر چہ از وی بہتری
آں قدر از فرط عصیاں روی خود دارم سیاہ ‎ ‎ ‎ کز سوادش نیلگوں گردید چرخ چنبری
نیست اے محبوب حق ملجائے من جز ذات تو ‎ ‎ ‎ چیست کز چشم عنایت سوئے عاصی بنگری[12]

مشاعرہ چہارم میں حسب ذیل بزرگ شعرا شریک ہوئے: شیخ محمد فیروزالدین فیروز، نواب شیخ غلام سبحانی محبوب، شیخ الٰہی بخش رفیق، مفتی امام بخش مفتی، مولوی احمد حسن شوکت، مولوی محمد الدین فوقی، حکیم شجاع الدین شجاع، رام داس قائل، مرزا رستم علی مرزا، مولوی عطاء اللہ عطا، مولوی رحیم بخش بخش، فضل الدین احقر، فقیر اللہ فقیر، مفتی غلام سرور سرور، محمد یاسین عاشق، محمد حیات فیض، محمد چراغ الدین لائق، تارا چند تارا، چراغ الدین چراغ، اور اڑوڑا رائے رائے۔[13]

نعت

مشاعرہ پنجم

گل فشاں کلک از بمدح سید بطحا کنم ‎ ‎ ‎ صفحہ قرطاس رشک جنت الماوا کنم
آں شہ والا منش کز نسبت دربانیش ‎ ‎ ‎ فخر خود دانند گر با موسیٰ و عیسیٰ کنم
سورہ والنور وصف عارض پر نور اوست ‎ ‎ ‎ سورہ واللیل وصف زلف عنبر سا کنم
در ثمیں لعل و دُر و یاقوت افشاند مدام ‎ ‎ ‎ چوں زباں را در بیان نعت او گویا کنم
در زبان من چناں تاثیر مدح او شدہ است ‎ ‎ ‎ شرمت از دعوی اعجاز چوں عیسیٰ کنم
چند بار احیائے اموات اواز و شد ہیچ نیست ‎ ‎ ‎ گویم از یکبار قم احیائے صد موئے کنم

نسبتے باشد کہ ذرہ را بود با آفتاب   با کف پائے تو گر ذکر ید بیضا کنم
ذات پاک ممکن اندر چشم صورت بین بود   عین واجب بنگرم چوں چشم در معنی کنم
آرزو دارم کہ بوسم آسان پاک تو   تو بنائے چشم خاک یثرب و بطحا کنم
مشتری نور ماہ و زہرہ کے باشم زدل   چوں ز خورشید جمالت چشم دل بینا کنم
زتپ آہے کہ از افراط عصیاں می زنم   آتش سوزندہ بام گنبد مینا کنم
آرزویم ہست اے محبوب تا روز ابد   جا بخاک آستاں آں شہ والا کنم[14]

مشاعرہ پنجم میں مندرجہ ذیل شعرا نے نعتیہ کلام پیش کیا:

نواب شیخ غلام محبوب سبحانی، مفتی غلام سرور سرور، مولوی محمد الدین فوقؔ، مفتی امام بخش مفتیؔ، حکیم شجاع الدین شجاعؔ، مولوی عطاء اللہ عطاؔ، مرزا رستم علی مرزاؔ، مولوی محمد یاسین شاہ عاشقؔ، مولوی تصدق حسین حیرتؔ، سید فیض علی جعفرؔ، مولوی احمد حسن شوکتؔ، فقیراللہ فقیرؔ، رحیم بخش بخشؔ، شیخ الٰہی بخش رفیقؔ، محمد حیات فیضؔ، چراغ الدین چراغؔ، اڑوڑا رائے رائےؔ، سید اسداللہ اسدؔ، فضل الدین احقرؔ اور تا را چند تا را۔[15]

عالی جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی
رئیس اعظم لاہور پریذیڈنٹ انجمن مشاعرہ

نے ہوائے کوثر و خلد بریں داریم ما   نے تمنائے لقائے حور عین داریم ما
جام بادہ کوثر است وکوی جانان است خلد   حور جنت دلربائے نازنین داریم ما
از خطائے ماست دارم از سر مشک ختن   چون بسر سودای زلف عنبرین داریم ما
بر مزار ما گل نرگس بباید کاشتن   زانکہ در دل عشق چشم نرگسین داریم ما
شد سعادت را عطارد مشتری از بخت ما   زاں کہ مہر مہ رخ زہرہ جبین داریم ما
کفر وایمان راست رونق از وجود ما بدہر   سوے کعبہ رو و قشقہ بر جبین داریم ما
قول شیخ و برہمن کیسان بود عشاق را   سبحہ در دست و بت در آستین داریم ما
درہوائے گیسوئے مشکین اوبعد از وفات   آرزوئے دفن در صحرائے چین داریم ما
درفراق زلف رخسار صنم ہر روز و شب   درد ہمدرد و دل غم ہمنشین داریم ما
ہیچ باک از روز رستا خیز اے محبوب نیست   چون پناہ لطف شاہ مرسلین داریم ما[16]

مصرع طرح

لرزہ براندام تیغست ازخم ابروی دوست

عالی جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی صاحب رئیس لاہور

چہرہ خورشید شد روشن زعکس روئے دوست   نافۂ مشک ختن دار و خم گیسوئے دوست
گل زخجلت آب گردو پیش رنگ روے دوست   سنبل آشفتہ شود از رشک چین موئے دوست
ریخت خون عاشقان زانوئے رنگین نگار   کشت مردم را نگاہ چشم پر جادوے دوست
سینہ را سازم سپر جان را فدائش گر رسد   تیر مژگان از کمان پرخم ابروئے دوست
کفر و ایمان را ندانم کعبہ و بتخانہ چیست   مشرب من عشق گشت و معبد من کوئے دوست
جان گرفتار بلائے غمزہ بہ ناز صنم   مرغ دل پابند دام حلقہ گیسوئے دوست
بعد مردن بہ مزارم سرو باید کا شتن   زانکہ جان دادم بیاد قامت دل جوے دوست
کلک من آتش فشاند نامہ گردو شعلہ   گر نگارم شمۂ سوز دل خود سوی دوست
از جفا و جور اوز مہر و عشق من مترس   کز ازل این عادت من گشت آن شدخوئے دوست
بگذاری محبوب از فکر غم دنیائے دون   ناتوانی صرف ہمت کن بحت جوی دوست [۱۷]

مصرع طرح

بیابیا کہ چوزلفت ولم پریشان است

عالی جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی صاحب رئیس لاہور متخلص بمحبوب

ولم ربودۂ آن شوخ نا مسلمان است   کہ کفر زلف سیاہش بلاے ایمان است
جبین چو زہرہ نگہ برق ولعل او چو شفق   چو مہر چہرہ و عارض چو ماہ تابان است
تجل ز گیسو و روے و عذار و قامت او   بنفشہ و گل و نسرین و سر بستان است
ولا مشابہت چشم شوخ فتانش   بچشم حورزمین قصور انسان است
شرارہ ایست جہنم ز آتش آہم   ز اشک دیدۂ من قطرہ آب طوفان است
شدن بخون دل آلودہ شوق دامن ماست   بعشق چاک شدن خواہش گریبان است
ہواے آتش عشق تو دارم و دانم   کہ خاک کوئے تو بہتر زآب حیوان است
خطا بود کنم از شوق سیر چین و ختن   کہ در سرم سر گیسوی مشک افشان است
چو دید واعظ خود بین جمال آن محبوبؔ   ز قول باطل و ازفعل خود پشیمان است [۱۸]

مصرع طرح

دل را بطاق ابروے جانانہ سوختیم

عالی جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی صاحب رئیسِ لاہور متخلص بہ محبوب

بر تاب حسن عارض جانا نہ سوختیم | بر شمع روئے یار چو پروانہ سوختیم
تا خواندہ ایم ، سبق حرف عشق را | از علم و عقل جملہ کتبخانہ سوختیم
دل را بتاب حسن جہانتاب دادہ ایم | جان بر جمال جلوہ جانا نہ سوختیم
در آب و خاک ماز ازل بود سوختن | لیکن بیکدمے نہ چو پروانہ سوختیم
دل درہواے آتش عشقش تمام عمر | شمع سان جہت مردانہ سوختیم
ساقی ما شکست چو پیمان رسوز دل | مینائے بادہ و خم و پیمانہ سوختیم
دل را بتاب حسن جہانتاب دادہ ایم | جان بر جمال جلوہ جانا نہ سوختیم [۱۹]

عالی جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب رئیس اعظم لاہور

غمزہ چون خنجر و مژگان چو سنانے دارد | نگہش تیر و دو ابرو دو کمانے دارد
چشم او نرگس ولالہ لب و عارض چو سمن | چہرہ او گل و چون غنچہ دہانے دارد
فرق در نیستی و ہست و ہانش گردید | آں چہ در وہمو گمان نیست میانے دارد
شوخی و ناز و ادا از پے دلبر باید | نہ کو چون سرو قد و غنچہ دہانے دارد
آہ سرد و رخ زرد و دل پژمردہ مدام | عاشق روے وے این جملہ فشانے دارد
بت من جلوہ بہر رنگ نماید محبوبؔ | کس نداند کہ چہ نام و چہ نشانے دارد [۲۰]

عالی جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب رئیس اعظم لاہور

دلم را درد درمان است بیمار آنچنین باید | غمم در جسم چوں جان است غمخوار ایں چنین باید
بیک دیدن ربودہ چشم مستش جان مردم را | بے دل بردن عشاق دلدار اینچنین باید
شدہ تیر قد من چون کمان از یاد او یاران | ز ہجر دلبران ابروے خمدار اینچنین باید
خجل شد سرو و نرگس سنبل و گل در گلستانہا | بتان را قد و چشم و زلف و رخسار اینچنین باید
نماند تا ابد مرغ دلم پابند گیسویش | بدام حلقہ را نقش گرفتار اینچنین باید
بہ درمانش شدہ درماندہ صد لقمان و افلاطون | بتان دلستان را چشم چار اینچنین باید

شفق بگرفت رنگ خون ز رشک اشک خونیم   ز بہر عاشقانش چشم خونبار آنچنین باید
چمن شد سینہ ام از داغہاے عشق آن گلرو   زبہر عاشقان محبوبؔ گلزار چنین باید[۲۱]

غزل من تصنیف جناب نواب شیخ غلام محبوب سبحانی صاحب متخلص بہ محبوب

سجدہ گاہم ز ازل گوشہ ابروی تو بود   دام جان و دل من حلقہ گیسوی تو بود
حالیا سجدہ نمایم بسوئے کعبہ جان   سعید و قبلہ من روز ازل روئ تو بود
شیوۂ کفر گرفتیم و گذشتیم زدین   کہ زمیثاق ولم بستہ بند و نیتو بود
چہ پری و ملک و حور و چہ انسان و چہ طیر   ہمہ جان دادۂ یک غمزۂ جادوئیتو بود
خودتو موسی شدی و طالب دیدار و لیک   جلوہ طور چہ دیدیم ہم از روئیتو بود
نرگس و سنبل و گل را چو بگلشن دیدم   ہمہ جا رنگ تو بود و ہمہ جا بوئیتو بود
خودتو مجنون و زلیخا شدے و عاشق زار   جلوہ لیلے و یوسف ہمہ از روئیتو بود
کعبہ میکدہ گشتیم و بہرجا کہ شدیم   ہمہ جا مطلب، جلوہ از روئیتو بود
فاش این راز مکن باش خموش ای محبوبؔ   کانچنین قال بہرحال نہ از خوی تو بود[۲۲]

مصنف حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں رقمطراز ہیں: ''انجمن پنجاب کے مشاعرے بند ہو گئے تو لاہور میں سکوت چھا گیا اور وہ سونا سونا نظر آنے لگا۔ ان حالات میں ایک ہفتہ وار مشاعرہ ''انجمن اتحاد'' کے اہتمام سے بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں قائم ہوا اور اس مجلس کی بنیاد حکیم شجاع الدین محمد نے ۱۸۹۰ء میں رکھی۔ موصوف اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب تھے۔ سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں مہارت کامل رکھتے تھے۔

''انجمن اتحاد'' کے مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء کے مکان پر ہوتے تھے جو کلام یہاں پڑھا جاتا تھا وہ ''شور محشر'' رسالے میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ طرحی غزلوں کا یہ گلدستہ ہر ماہ خان احمد حسین خان کی ادارت میں انجمن کی طرف سے نکلتا تھا جو اس مجلس کے روح رواں تھے۔ انھوں نے بعد میں اپنا رسالہ ''شباب اردو'' بھی جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔ وہ مرزا ارشد گورگانی کے ارشد ترین تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے یکم جنوری ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا۔

''شور محشر'' کے پہلے شمارے میں اس بزم کے پہلے مشاعرے جو روداد چھپی تھی اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس میں اس زمانے کے کیسے کیسے نامور لوگ شامل ہوتے تھے اور اردو زبان اس وقت پنجاب میں کس حد تک مقبول ہو چکی تھی۔

۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو پہلا جلسہ مشاعرے کا حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء کے عالی شان مکان پر شام کے چھ بجے ہوا۔ اس جلسے میں علاوہ منصلہ ذیل کے قریباً تین سو شائقین کی بھیڑ بھاڑ تھی:

۱۔ حکیم شجاع الدین شجاعؔ، میر مشاعرہ   ۲۔ نواب شیخ غلام محبوب سبحانی محبوبؔ

۳۔ مرزا ارشد گورگانی دہلوی
۴۔ منشی محبوب عالم مالک پیسہ اخبار
۵۔ منشی عبدالعزیز منیجر پیسہ اخبار
۶۔ لالہ موہن لال مطلب، نائب میر مشاعرہ
۷۔ میر نثار علی شہرت دہلوی
۸۔ مولوی احمد دین پلیڈر
۹۔ لالہ دھنپت رائے بی۔اے ایل ایل بی
۱۰۔ منشی میراں بخش بیرسٹرایٹ لاء
۱۱۔ میر ناظم حسین ناظم
۱۲۔ لالہ منوہر لال بی۔اے
۱۳۔ مرزا محبوب بیگ، بی۔اے
۱۴۔ پنڈت سکھ چین ناتھ ایم۔اے
۱۵۔ لالہ گوبند رام رئیس لاہور
۱۶۔ لالہ دل باغ رائے مالک البرٹ پریس لاہور
۱۷۔ شیخ دانش مند سقراط، ایم۔اے
۱۸۔ منشی شام لال مجبوؔر
۱۹۔ مرزا عبدالحسین عارفؔ
۲۰۔ حکیم شہباز الدین
۲۱۔ فقیر سید عابد الدین پلیڈر
۲۲۔ منشی غلام حسین شیدؔا
۲۳۔ شہزادہ محمد علی شہزادہ
۲۴۔ آغا سلطان علی کربلائی
۲۵۔ سردار گنڈا سنگھ مشرقیؔ
۲۶۔ مولوی عبدالرؤف خاں رافتؔ بھوپالی، ایڈیٹر پیسہ اخبار
۲۷۔ فقیر سید افتخار الدین
۲۸۔ خلیفہ نظام الدین
۲۹۔ حکیم امین الدین بیرسٹرایٹ لاء، سیکرٹری
۳۰۔ منشی احمد حسین خاں احمؔد، اسسٹنٹ سیکرٹری

اس بزمِ مشاعرہ کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس میں حضرت امیؔر مینائی جو اس زمانے میں رام پور سے لاہور تشریف لائے تھے، نہ صرف ہوئے بلکہ مصرعِ طرح پر ایک غزل بھی لکھی اور بذاتِ خود پڑھی۔ پھر اس کے بعد کے مشاعرے میں جو غالباً ۱۸۹۶ء میں ہوا اور جس کے لیے حسبِ ذیل طرح تجویز کی گئی تھی:

میرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبالؔ نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں نواب مرزا داغؔ دہلوی کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے:

نسیم و تشنہؔ ہی اقبالؔ کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغؔ سخنداں کا[۲۳]

ایک یادگار تقریب کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحبِ موصوف لکھتے ہیں:

''انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ عید رمضان کی تقریب پر حکیم امین الدین نے دعوت دی اور اپنے چیدہ احباب کو بلایا۔ حاضرین میں حسبِ ذیل اصحاب شامل تھے: نواب شیخ غلام محبوب سبحانی محبوبؔ، رئیسِ اعظم لاہور، مولوی محبوب عالم، مالک و مدیر پیسہ اخبار لاہور، شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اقبال، خاں احمد حسین خاں، خلیفہ نظام الدین، مولوی احمد دین وکیل، شیخ گلاب دین وکیل، حکیم شہباز الدین، خواجہ رحیم بخش، منشی غلام محمد ناظم، مرزا محبوب بیگ وکیل اور سید محمد شاہ وکیل۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عبدالقادر نے تجویز پیش کی کہ حضرت محمد اقبالؔ اور منشی احمد حسین خاں فی البدیہہ ایک ایک غزل کہیں اور سنائیں۔ آپ نے مومنؔ کا یہ شعر پڑھ کر اس کے دوسرے مصرع کی طرح مقرر کیا:

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیوں کر
فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیمان ہو گا[۱۴]

لٹریری سوسائٹی کے احیاء کے حوالے سے مؤلف موصوف تحریر کرتے ہیں: ''جب ہر طرف سے مشاعروں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو ۱۸۹۷ء میں خاں احمد حسین خاں نے نواب شیخ غلام محبوب سبحانی محبوبؔ رئیس اعظم لاہور خلف الرشید نواب شیخ امام الدین گورنر کشمیر کو سرپرست بنا کر مشاعروں کا سلسلہ از سرِ نو نواب صاحب کے اصطبل میں شروع کیا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ یہ اصطبل بھاٹی دروازے کے اندر اونچی مسجد کے قریب واقع تھا۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ نواب صاحب کا اصطبل لوہاری دروازے کے باہر انارکلی کے سرے پر ایک جگہ واقع تھا جہاں آج کل رائل ہوٹل یا سنٹرل ہوٹل کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ نواب صاحب خود بھی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ دیوان محبوبؔ (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) ان کی یادگار ہے، وہ مشاعرہ اتحاد یا لٹریری سوسائٹی کو اکثر زینت بخشتے اور اس میں اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ ان کا انتقال دربارِ دہلی کے موقع پر ہوا۔ ان کی نعش لاہور میں مزار سید علی ہجویریؒ کے احاطے میں دفن کی گئی۔''

حسب ذیل دو مزید غزلیں افادۂ عام کے لیے پیش کی جا رہی ہیں:

بوئے موئے تو ز مشک ختنے ساختہ اند
رنگ روئے تو ز در عدنے ساختہ اند
دُر دندانِ تو بہ دو آب ز الماس و گہر
لب لعلت چو عقیق یمنے ساختہ اند
چشم تو نرگس و لالہ لب و گیسو سنبل
عارضت عین گلے یا سمنے ساختہ اند
قامت سرو رواں غنچہ دہن روئے تو گل
جان من جسم تو گو چمنے ساختہ اند
جنت از خاک در ہجو توی شد پیدا
دوزخ از سوز دل ہجو منے ساختہ اند
مطلب ہر دو یکے دو ہست و لے از پئے فصل
آں یکے شیخ، دگر برہمنے ساختہ اند
جلوہ گر در ہمہ جاہلیت جمال محبوبؔ
نام بت خانہ و مسجد سخنے ساختہ اند

اے جاں فدائے غمزۂ آں دلربا شدی
اے دل شہید خنجر ناز و اداشدی
ناز و ادا و خشم و تغافل، عتاب و قہر
گویا کہ جامع ہمہ جور و جفا شدی
شد زہرہ مشتری و سعادت زبخت من
ز اندم کہ مہرباں بمن اے مہ لقا شدی
تشبیہ زلف یار کہ کردی بمشک چیں
محبوبؔ زیں خیال غلط بہ خطا شدی[۲۵]

غزل جناب نواب محبوب سبحانی صاحب رئیسِ لاہور

اگر سربسر گیسوے مشکبووارے
زمشک چیست خطا گر تو گفتگو وارے

بپای دیدہ گذرایدل از سر ہر خار
قدم اگر بہ رہ جستجوی او وارے

لبت چو لالہ و چشم تو غیرت نرگس
چو مہر عارض تابان چو ماہ رووارے

بباز ہر نماز جنازہ ام ایجان
نگر ز خون دل من اگر وضو وارے

چہ رونق است برنگ لبش ترا ای لعل
گہر تو پیش رخ او چہ آبرو وارے

چہ لاف نیرنی ای گل زحسن وخوبی خویش
تو کی چو عارض رنگیش رنگ و بو وارے

قصور تست اگر مہر حور در دل تست
بہر چو دلبر ہر مہر ماہر و وارے

ہوای حورمکن الفت پری بگذار
چو دیدن رخ محبوبؔ آرزو واری[۲۶]

غزل جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب رئیسِ لاہور متخلص بہ محبوب

چینی زنازکان بت چین بہ جبین رواست
صد تیر جور بہ دل وجان حزین زداست

ہر شعلہ کہ آہ من از دل برون کشید
از آسمان گذشتہ بعرش برین زداست

از جلوہ ات جمال پری در خجالت است
صد طعنہ حسن رویتو بہ حورعین زداشت

گویم چہ حال خود کہ بت کافر فرنگ
دل را نمود غارت و دتق بدین زداست

خون از دلم روان شدو بین بے خبر از نیکہ
ابرو کمان خدنگ نگہ از کمین رو است

انسان چرا نہ والہ شور چون زعین شوق
صد بوسہ بر دو چشم تو آہوی چین زداشت

محبوب پاک حشر ندارد بدل جواد
وقتی بدامن شہ دنیا و دین زداشت[۲۷]

حوالہ جات

۱۔ اردو: پاکستان کی قومی زبان، مؤلفہ میاں بشیر احمد، مرتبہ محمد حنیف شاہد، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۷ء ص ۹

۲۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۲ء ص ۴۵، ۴۶

۳۔ تذکرہ روسائے پنجاب، مؤلفہ سر لیپل گریفن، جلد اول، ص ۵۱۹، نیز گزیٹیر آف لاہور ڈسٹرکٹ بابت ۱۸۹۴ء۔۱۸۹۳ء

۳۔الف یادگارِ دربار، مؤلفہ و مرتبہ مولوی فیروز الدین مطبوعہ صدائے ہند پریس لاہور، ۱۹۰۳ء ص ۲۰۷

۴۔ مشاعرہ نخستیہ لاہور مطبوعہ خورشید عالم پریس باہتمام میاں امام الدین ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ

۵۔ سہ ماہی صحیفہ بابت اپریل ۱۹۷۲ء شمارہ ۵۹ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء ماخوذ از اخبارات و رسائل انجمن پنجاب مؤلفہ محمد حنیف شاہد، صفحہ ۱۳

۶۔ گلدستہ انجمن (طرحی غزلوں کا مجموعہ) مئی ۱۸۸۳ء تا ستمبر ۱۸۸۳ء جن کو سیف الحق ادیب ایڈیٹر گلدستہ انجمن نے مدوین کیا اور سید امیر شاہ سیکرٹری مشاعرہ انجمن کے ارشاد اور پریذیڈنٹ انجمن پنجاب ڈاکٹر جی۔ڈبلیو لائٹز کے ایماء مطبع انجمن پنجاب لاہور میں میاں نظام الدین پرنٹر کے اہتمام سے چھپا۔ ۱۸۸۳ء صفحات ۱ تا ۹۶

۷۔ سہ ماہی صحیفہ بابت اپریل ۱۹۷۲ء شمارہ ۵۹ مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۱۵۔ مؤلفہ راقم الحروف مضمون بعنوان اخبارات و رسائل انجمن پنجاب۔

۸۔ حوالہ مذکور، صفحہ ۱۵، گلدستۂ سخن اور گلدستۂ انجمن کے بارے میں مزید معلومات کے لیے صفحات ۱۶ اور ۱۷ ملاحظہ فرمایئے۔

۹۔ مشاعرہ نخستیہ لاہور، گلدستۂ سخن، انجمن پنجاب لاہور مطبع خورشید عالم لاہور، باہتمام میاں امام الدین، ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۶ء

۱۰۔ مشاعرہ سوم حوالہ مذکور، ص ۲۹

۱۱۔ حوالہ مذکور، ص ۲۹

۱۲۔ مشاعرہ چہارم حوالہ مذکور، ص ۳۴

۱۳۔ حوالہ مذکور، ص ۳۴

۱۴۔ مشاعرہ پنجم، ص ۳۸

۱۵۔ حوالہ مذکور، ص ۳۸

۱۶۔ گلدستۂ انجمن: انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں کی طرحی غزلیں من ابتدائے ماہ مئی ۱۸۸۳ء بغایت ستمبر ۱۸۸۳ء مرتبہ و مدوین سیف الحق ادیب ایڈیٹر گلدستہ انجمن مطبع انجمن پنجاب لاہور، ۱۸۸۳ء، ص ۹۵۔۹۶

۱۷۔ حوالہ مذکور، ص ۷۱

۱۸۔ حوالہ مذکور، ص ۷۴

۱۹۔ حوالہ مذکور، صفحات ۷۹۔۸۰

۲۰۔ حوالہ مذکور، صفحات ۸۲۔۸۳

۲۱۔ حوالہ مذکور، ص ۸۷

۲۲۔ حوالہ مذکور، ص ۲۰

۲۳۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں، مرتبہ و مؤلفہ محمد عبداللہ قریشی، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۲ء ص ۶۶۔۶۷

۲۴۔ حوالہ مذکور، ص ۷۰

۲۵۔ حوالہ مذکور، صفحات ۹۰، ۹۳، ۹۴

۲۶۔ رسالہ انجمن اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب، بابت جولائی ۱۸۶۷ء جلد ۳، نمبر ۲۳، ص ۲۵

۲۷۔ حوالہ مذکور، جولائی ۱۸۶۷ء جلد ۳ نمبر ۲۳، ص ۴۲

قیام پاکستان سے پہلے مسلمان عورتوں میں تعلیمی بیداری کے مراحل اور حکومتی کوششیں (۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء)

مسز ساجدہ شبیر

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ۱۹۴۷ـ۱۹۲۰ء کا دور بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس دور میں ملک میں بشمول آئینی اصلاحات دو عالمی جنگیں اور قومی تحریکوں میں ڈرامائی ترقی ہوئی۔ ان تمام باتوں سے بالاتر عورتوں کی آزادی کی تحریک بھی درحقیقت اسی دور میں شروع ہوئی۔ مسلمان عورتوں کی تعلیم اس احساس کے ساتھ کہ ایک عورت کو تعلیم دینے کا مطلب پورے معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانا ہے بھی ایک اہم Issue کے طور پر ظاہر ہوا۔ درحقیقت عورتوں کی زندگی میں اس نئی تبدیلی نے ان کو گھروں سے سکول اور کالجوں کے لیے باہر نکالا۔ اب عورتوں نے عام مقاماتِ زندگی میں جانا شروع کر دیا، جس سے اُن کے حالات میں بہتری پیدا ہوئی۔

قبل ازیں کہ اس پر نظر ڈالی جائے، بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سیاسی تبدیلی مسلمان عورتوں کو عام زندگی میں لانے کا باعث بنی۔ یہ اہم بات ہے کہ اُس وقت کا معاشرہ انیسویں صدی کے پرانے سوچ میں مبتلا تھا جس میں کامیابی کی امید نہیں دکھائی دیتی تھی کہ اچانک عورتوں کو مکمل اُن کے نئے انداز میں عوامی تحاریک کے میدان میں شامل کیا گیا۔ عورتوں کے نئے کردار یعنی قومی تحاریک میں تیزی سے شمولیت نے ان کے مفادات کو اور بھی یقینی بنایا۔ خاص طور پر تعلیم کے میدان میں عورتیں اُس وقت برسرِ عام آئیں، جب ہندوستان کے مسلمان جمہوری نظام کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مصروف تھے۔ اُس وقت وہ اپنی شناخت اس جمہوری نظام کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُس وقت اِس عمل کا سب سے بڑا مظاہرہ منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء کے تحت ان کی علیحدہ نمایندگی کا مطالبہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی دلچسپیاں سیاسی میدان میں بڑھتی گئیں۔ ان کے زیادہ تر مطالبات اتحادِ اسلامی کے تھے جن میں سب سے زیادہ موثر تحریکِ خلافت تھی کہ ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کو بحال کیا جائے۔ اِن تحاریک کا عورتوں کے کردار کے بارے میں فیصلہ کن اثر ہوا جب کہ اس سے پہلے عورت کو بغیر عوامی کردار کے محض خاتونِ خانہ کی شکل میں ہی دیکھا گیا۔ اب عورت کے لیے تحاریک جن میں مسلمان مرد مکمل طور پر Involve تھے، کو مدد اور حوصلہ افزائی کا ایک اہم ذریعے کے طور پر دیکھا گیا[۱]

پہلی مسلمان عورت جس نے اس دور میں اپنے آپ کو قومی تحریک کے لیے پیش کیا، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ بی اماں تھیں۔ ان کی پہلی Appearance ۱۹۱۳ء میں انجمن خدام کعبہ کی تنظیم کے پلیٹ فارم پر ہوئی جو کہ بی اماں کے بیٹوں اور ان کے مذہبی پیش رو لکھنو کے فرنگی محل کے مولانا عبدالباری نے قائم کی۔ اِس انجمن کے قیام کا مقصد کعبہ کا احترام اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کی غیر مسلموں کی جارحیت سے حفاظت تھی۔ انجمن کی خواتین کی عام طور پر میٹنگز دہلی اور لکھنو میں ہوتی تھیں اور اِن

میں سے اکثر نے اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے اپنے سونے کے زیورات اس انجمن کو بطور عطیہ دیے۔[۱۲]

اس مقام پر مسلمان عورتوں کی ہم جنس عیسائی اور ہندو عورتوں نے خوب حمایت کی۔ موخر الذکر میں مسز اینی بسنت، سروجنی نائیڈو، سالا رو یوی اور بسنتی دیوی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے تحریک خلافت اور سول نافرمانی کی تحریک میں بی اماں، بیگم حسرت موہانی اور دوسری مسلمان عورتوں کے ساتھ حصہ لیا۔ اس دور میں عورتوں کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

پہلا حصہ اُس دور میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے مختلف مراحل اور عورت کی تعلیم کے لیے کوشاں تنظیموں پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ مندرجہ بالا دور میں جدید تعلیم جو کہ متعارف کروائی گئی اُس پر مسلمان عورتوں کے رویے پر دلالت کرتا ہے۔ جب کہ تیسرا اور آخری حصہ مسلمان تعلیم یافتہ عورتوں کی عام زندگی کے کردار سے متعلق ہے۔

مسلمان عورتوں کی تعلیم

مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بڑھتے ہوئے رجحانات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرکزی حکومت نے اکثر صوبائی حکومتوں کے ذریعے مختلف معیار (Measures) متعارف کروائے۔ یوں مسلمان طلبہ و طالبات کے لیے ملک کے اکثر حصوں میں علیحدہ سکول قائم کیے۔ ۱۹۱۶ء میں متحدہ صوبوں کے مقامی ضلعی بورڈ نے سپیشل پرائمری مکتب سکول کھولے۔ جس میں مسلمان طلبہ کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے بھی آراستہ کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے پردے کے انتظامات بھی کیے جاتے تھے۔ مسلمان طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے آدھی فیس پر داخلہ، اضافی ترمیتی کلاسز کا اجرا اور مسلمان سکولوں کے لیے مسلمان معائناتی عملے کی تقرری جیسے اقدامات کیے گئے۔[۱۳]

انیسویں صدی کے اردو ہندی تنازع نے علیحدہ قومی مذہبی شناخت کے لیے ایک اہم کردار ادا کیا۔ ذریعہ تعلیم اردو بنانے کی پہلی کوشش محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے ہوئی۔ جس کی بنیاد ۱۸۸۶ء میں سر سید احمد خان نے ڈالی۔ ۱۹۰۳ء میں کانفرنس میں اردو سیکشن تشکیل دیا گیا جو کہ انجمن ترقی اردو کے نام سے مشہور ہے۔ اس کانفرنس نے حکومت پر زور دیا کہ ان سکولوں میں جہاں مسلمان طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اردو کو تدریسی زبان کے طور پر اختیار کیا جائے۔ خاص طور پر پرائمری سطح پر اردو کی حکومتی سرپرستی کی ذمہ داری مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے لی گئی تھی۔

اہم ادارے

برطانوی ہندوستان میں مردوں کی تعلیم کی طرح عورتوں کی تعلیم کے لیے تین اہم ادارے حکومت، عیسائی مشنری اور سماجی مصلح تھے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بیسویں صدی میں جو اولین کوششیں کی گئیں، وہ خاص طور پر ہندوستانی معاشرے کے روایتی Frame Work کے مطابق تھیں۔ اگلے چند سالوں میں تعلیم میں جدت پیدا کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے۔[۱۴]

ریاست کا کردار

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں ریاست نے تعلیم کے میدان میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے حکومت نے اضافی سہولیات کی فراہمی جاری رکھی۔ مسلمان طالبات کو مقامی ضلعی بورڈ اور میونسپل پرائمری سکولوں

میں بغیر ادائی فیس کے داخل کیا گیا۔فیس معافی کے ساتھ ساتھ مسلمان طالبات کے لیے پرائمری سطح پر خصوصی وظیفہ مقرر کیا گیا۔بنگال میں رجسٹرڈ سکولوں کی تعداد ۱۵۰۰ سے بڑھ کر ۲۱۰۰ تک ہوگئی۔نظر ثانی نصاب مکتب کے لیے متعارف کروایا گیا۔یہی منصوبہ متحدہ صوبوں میں بھی اپنایا گیا۔حکومتی امداد کی وجہ سے مکتب سکولوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔[۵]

اس طرح صوبہ بہار اوراڑیسہ میں Recognised مدرسوں کے امتحان کی نگرانی اور نئے سلیبس کو متعارف کروانے کے لیے ''مدرسہ امتحانی بورڈ'' تشکیل دیا گیا۔۱۹۲۶ء میں آسام میں دوسری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔اس کانفرنس میں صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کافی قراردادیں پاس کی گئیں۔جن میں جونیئر مدرسہ کے کورس میں بہتری، تا کہ اس کو مڈل کے برابر لایا جاسکے، نصابی کتب کی نظر ثانی اوراس طرح خاص معائناتی عملہ کی تقرری بھی شامل تھی۔[۶]

اِس کانفرنس کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ لڑکیوں اورعورتوں کی سماجی اصلاحات کی قانون سازی کے لیے قرارداد کا پاس کرنا تھا۔ان اصلاحات کے سلسلے میں تعلیم نے سیاسی قوت اور ہندو مسلم دونوں Community کی شناخت کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ان حالات میں حکومت نے قانون ساز کونسل کے اتفاق سے تعلیم کی بہتری کے لیے بڑی رقوم مختص کیں اور نئی تعلیمی سکیمیں متعارف کروائیں۔ہندوستانی قانونی کمیشن کی امدادی کمیٹی کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیا گیا،تا کہ پرانی تعلیمی ترقی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لیے مناسب تجاویز پیش کی جائیں۔۱۹۲۷ء میں سر فلپ ہارٹوگ کی زیرِ صدارت کمیٹی کی تقرری ہوئی۔ہارٹوگ نے اپنی عرض داشت بعنوان ۱۹۲۹ء میں ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی نشوونما میں ہندوستانی عورتوں کی طرف سے تعلیم کی شدید خواہش کی تعریف کی۔حتیٰ کہ ان صوبوں کی طرف سے جہاں پردے کا خاصا اہتمام تھا جیسا کہ پنجاب یو۔پی اور بنگال میں۔[۷]

اُس نے اِس ترقی کو پردے کی پابندی میں مرحلہ وار زمی اور پابندی شادی طفلاں ایکٹ ۱۹۲۹ء کے نفاذ سے منسوب کیا۔حکومت نے ہارٹوگ کمیٹی کی تجاویز کی روشنی میں تعلیمی اصلاحات کے لیے مزید اقدامات کیے۔اِصلاحات کو نہ صرف ملک کے نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں میں خوش آمدید کہا گیا۔بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے اِن صوبوں میں جہاں اب تک روایتی تعلیمی نظام تھا وہاں پر بھی اس کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ساردا ایکٹ کے نفاذ نے مسلمان عورتوں کو اس قابل بنایا کہ وہ سماجی بیڑیوں کی بندشوں سے آہستہ آہستہ آزاد ہوئیں۔[۸]

برطانوی ہندوستان میں طالبات کی مکمل تعداد ۴،۶۸،۶۴،۲۴ تھی۔مسلمان طالبات کی تعداد ۱۳،۷۶۴۷ تھی، جن میں سے ۵۱۲۳۵۹ طالبات Recognised اداروں میں پڑھ رہی تھیں، جب کہ ۸۱۳۵۴ طالبات Unrecognised سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔[۹]

یہ رجحان ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء کے دور میں جاری رہا۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت اقدامات

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کی مکمل آزادی کی پیش رفت کے لیے ایک اہم قدم ثابت ہوا۔اس ایکٹ سے انتظامیہ کی دو عملی کے نظام کا خاتمہ ہوا۔مخصوص اور Transfered محکموں کے درمیان امتیاز ختم ہوا۔تمام صوبائی انتظامیہ کو ایک وزارت کے ماتحت کیا گیا۔صوبائی خودمختاری کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں ترقی کی امیدیں ایک دم بڑھ گئیں۔تعلیم کے میدان میں اس دور کی

کامیابیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مرکزی حکومت کے زیر انتظام تعلیمی اصلاحات

(۲) مختلف صوبوں میں مقامی حکومتوں کی تعلیمی سرگرمیاں

مرکزی حکومت کی کوششیں

اس دور میں مرکزی حکومت کی کوششوں کو تعلیم کے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کی مختلف سرگرمیوں میں کافی حد تک پیش کیا گیا۔بورڈ نے ۱۹۳۷ء میں واردھا تعلیمی کمیٹی قائم کی جو کہ Self Supporting کے بنیادی اصولوں کی تعلیم کے متعلق تھی۔اس کمیٹی نے ۷ سے ۱۴ سال کی عمر تک تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ایک لازمی تعلیمی نظام کی حمایت کی۔[۱۰]

صوبائی سطح پر کوششیں:

۱۹۳۷ء کے بعد کی دہائی مسلمانوں کے لیے سماجی اور سیاسی مشکلات لیے ہوئے تھی۔قانونی طور پر عورتوں کا جائیداد میں حصہ اور اسی طرح طلاق حاصل کرنے کا حق بھی اسی دور میں ہوا۔علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ اسی دور میں زور پکڑتا گیا۔ان حالات میں اکثر مسلمانوں نے لڑکیوں کے نئے تعلیمی مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ان کی عورتیں حکومتی اور یورپی سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔پنجاب میں بھی عورتوں کے تعلیمی میدان میں اہم ترقی ہوئی۔تعلیمی طور پر پسماندہ صوبہ N.W.F.P (خیبر پختون خواہ) میں بھی تعلیم نسواں کے پھیلاؤ پر زور دیا گیا۔مسلمان طالبات کی تعداد ۳۴۷۸ تھی جو کہ مقامی طالبات کا ۹ فی صد تھا۔[۱۱]

یو۔پی میں مزید ہائی سکول اور کالج کھولنے کے مطالبات کیے گئے۔اس صوبے میں لوگ بیٹوں کے بجائے بیٹیوں کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے کیوں کہ اکثر لڑکے اپنے بزرگوں کے ساتھ کاروبار میں مصروف ہو جاتے۔اس کے برعکس لڑکیوں کے لیے تعلیم حاصل کرنے کا اچھا موقع تھا۔کیوں کہ ان کو لڑکوں کی طرح کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔کچھ مالدار خاندانوں کی لڑکیاں ثانوی اور اعلیٰ ثانوی کلاسز تک تعلیم حاصل کرتی تھیں۔کبھی کبھار لڑکیوں کو شادی کرنے کے بعد بھی تعلیم جاری رکھنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ دوسرے صوبوں کی طرح مرکزی صوبوں کے مسلمان بھی معاشرے کی کایا پلٹنے میں بھرپور حصہ لے رہے تھے۔ان میں سے اکثر کو تعلیم نسواں کی ضرورت کے لیے قائل بھی کیا گیا۔۱۹۴۳ء میں ڈائریکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشن نے تعلیم نسواں کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرنے کے لیے اقدامات کیے۔اس سکیم کو زیادہ قابلِ عمل بنانے کے لیے ۱۹۴۴ء میں تعلیم نسواں کی ایک کانفرنس میں O.S.D آفیسر نے اپنی رپورٹ مع سفارشات کے پیش کی۔کانفرنس میں ہندوستان کے تمام حصوں سے آئے ہوئے ماہرینِ تعلیم موجود تھے۔[۱۲]

عیسائی مبلغین

ہندوستان میں عیسائی مبلغوں نے تعلیم نسواں کے لیے ایک بڑا اہم کردار ادا کیا۔انھوں نے نہ صرف بکثرت تعداد میں گرلز پرائمری سکول قائم کیے، بلکہ ثانوی سکول، صنعتی گھر اور مسلم خواتین کے لیے تربیتی ادارے بھی قائم کیے، جو کہ خاص طور پر ان کے زیر اثر ہوتے تھے۔وہ اس میں پورا یقین رکھتے تھے کہ معاشرہ کی تعمیر نو کے لیے عورت کو تعلیم دینا ضروری ہے۔تعلیم کے میدان میں عیسائی مبلغوں کی برتری دیکھ کر اکثر ہندوستانی ان سے متاثر ہوئے۔آریہ سماج اور ایجوکیشنل سوسائٹی آف پونہ گرلز سکول، کالجز اور ہسپتال قائم

کر کے عیسائی مشنری کے ساتھ ہمسری کی کوشش کی ۔عیسائی مشنریوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں شمالی ہندوستان میں کام کیا۔

جہاں پر مسلمانوں کی تعلیم زیادہ تھی مسلمانوں کا رویہ بھی خاص سرگرم نہیں تھا۔ جتنا کہ ہندوستان کے دوسرے گروہ تھے۔ان حالات میں خاص طور سماجی، مذہبی عناصر کے تجزیے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔مسلمان عورتیں اس وقت تعلیم کے میدان میں آئیں جب کہ ان کے مرد اس عمل سے گزر چکے تھے۔جہاں تک جدید تعلیم نسواں کا تعلق ہے۔کمیونٹی میں عام طور پر اس جدید تعلیم کو غیر اسلامی جانا جاتا تھا۔ان تمام رکاوٹوں اور مذہبی منافرت کے باوجود عیسائی مبلغین کی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کوششوں کو مسلمانوں کی طرف سے یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا۔[۱۳]

پنجاب اور مدراس کی بڑی تعداد میں عیسائی سکولوں میں داخلہ لیا ہے۔[۱۴]

سماجی مصلحین کا کردار

مسلمان تعلیم نسواں کے لیے تیسرا ادارہ سماجی مصلح کا تھا، جس کا یا تو کسی تنظیم کے ساتھ الحاق تھا یا آزادانہ طور پر کام کرتے تھے۔انیسویں صدی کے آخری نصف میں ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی اصلاح کے لیے دو ممتاز تحاریک شروع ہوئیں۔دونوں تحاریک ظاہراً ثقافتی مگر طاقتی طور پر سیاسی تھیں۔ایک تحریک علمانے شروع کی۔انھوں نے اسلامی قوانین کے اہتمام اور بنیادی مذہبی تعلیمات کی ترقی کے لیے مدرسہ کی روایتی تعلیم کے لیے اصلاح شدہ نصاب متعارف کروایا۔اس کی سب سے بہترین مثال ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ہے۔دوسری تحریک علی گڑھ میں سرسید احمد خان کی قیادت میں شروع ہوئی، جس نے مسلمانوں کے لیے مغربی تعلیم کی حمایت کی۔ابتدا میں خواتین کی تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے پہلا قدم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اٹھایا جو کہ ۱۸۸۶ء میں قائم کی گئی۔۱۹۰۳ء میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔پہلی مرتبہ خواتین کو مدعو کیا گیا۔چاند بیگم جو کہ مدراس سے تعلق رکھتی تھیں، نے آواز اٹھائی اگرچہ وہ خود اس اجلاس میں شریک نہ ہوئیں لیکن ان کی تحریر ایک پارسی خاتون نے پڑھ کر سنائی۔چاند بی بی نے مسلم خواتین سے کہا کہ وہ وسیع سطح پر تعلیم حاصل کریں۔[۱۵]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیاں خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں اس وقت وسیع ہوگئیں جب آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس ۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی۔ابتدا میں اس فورم سے جن خواتین نے شرکت کی ان میں بیگم سید محمود جو کہ سرسید احمد خان کی بہو بیگم عبداللہ، شیخ عبداللہ کی بیوی، آبرو بیگم مولانا ابوالکلام آزاد کی بہن جیسی خواتین نے ثابت کیا کہ مسلمان عورتیں بھی اپنی بہنوں کی سماجی بہتری کے لیے کام کر سکتی ہیں۔اس کانفرنس کے ذریعے خواتین میں جدید تعلیم کی خواہش پیدا ہوئی۔

حیدرآباد

نظام حیدرآباد نے مسلم خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔انھوں نے کئی مکتب اور سکول مختلف ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر پر قائم کیے، جن میں خاص طور پر نمپالی ہائی سکول، محبوبیہ ہائی سکول، سٹینلے ہائی سکول اور ایس ٹی جارج گرائمر ہائی سکول نمایاں ہیں۔تاہم ان کا قابل ذکر کارنامہ ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے۔جہاں تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔اس سے ملحقہ کالجوں اور حیدرآباد زنانہ کالج نے بائیر ڈگری کے لیے سائنس اور آرٹس دونوں میں مضامین اردو میں متعارف کروائے۔یہ کالج حیدرآباد میں ۱۹۲۴ء میں انٹر کلاسز کے ساتھ شروع ہوا۔۱۹۲۶ء میں ڈگری کلاسز شروع ہوئیں۔اس کالج کی پرنسپل ڈاکٹر آمنہ پوپ

تھیں انھوں نے رائل کالج آف میوزک لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر آمنہ پوپ نے کالج میں سائنس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔ جہاں ریاضی، فزکس، کیمسٹری، باٹنی اور زوالوجی مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ یہ تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ مسلمان طالبات پردے میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی تھیں۔[۱۶]

حیدرآباد کی مختلف خواتین نے مسلمان طالبات کی تعلیم میں دلچسپی لی جن میں بیگم حیدری، سر اکبر حیدری کی بیوی صغریٰ ہمایوں اصغر، مشہور رائٹر اشرف النساء بیگم مقامی کارکن نے حیدرآباد میں خواتین کی تعلیمی ترقی کے لیے کئی ادارے کھولے۔

مدراس

اس قسم کا کام مدراس میں بھی ہوا۔ مولوی عبدالحق پرنسپل اسلامیہ کالج مدراس، پروفیسر عبدالوہاب اور ڈاکٹر برہان النساء نے مقامی طالبات کی تعلیم میں دلچسپی لی۔ اس سلسلے میں بیگم امیر الدین جو کہ آغا جلال الدین حسین (حبل المتین اخبار کلکتہ کے ایڈیٹر کی بیٹی تھیں) کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اپنی شادی کے بعد یہ اپنے شوہر جسٹس امیر الدین کے ہمراہ مدراس میں مقیم ہو گئیں، جہاں پر انہوں نے مسلم خواتین کی تعلیمی مہم میں اہم کردار ادا کیا۔[۱۷]

بمبئی

بمبئی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر اقلیتیں بھی رہتی تھیں۔ اگرچہ ان کی تہذیب اور زبانیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں، تاہم اردو ابلاغ کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھی۔ بمبئی پریذیڈنسی کے کئی حصوں میں انجمن اسلام نے اردو سکول کھولے۔ مسٹر عثمان صوبانی کی مدد سے انجمن اسلام نے بمبئی میں لڑکیوں کے لیے ہائی سکول قائم کیا۔[۱۸]

بنگال

بنگال میں مسلم خواتین کی تعلیم کی تاریخ رقیہ سخاوت حسین کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے جو کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک مقامی کارکن خاتون تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں رقیہ نے کلکتہ میں سخاوت حسین گرلز سکول کھولا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ ہائی سکول بن گیا۔ اس کے نصاب میں فزیکل ایجوکیشن، ہینڈی کرافٹس، سلائی کڑھائی، کھانا پکانا، نرسنگ، ہوم اکنامکس اور باغبانی کے مضامین شامل تھے۔

یوپی

یو۔ پی میں مسلم خواتین کے کام کو آگے بڑھانے میں شیخ عبداللہ اور جسٹس سید کرامت حسین نے اہم کردار ادا کیا۔ شیخ عبداللہ نے ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ میں گرلز سکول قائم کیا جو کہ ۱۹۲۵ء میں انٹر کالج بن گیا۔ ۱۹۳۷ء میں یہاں ڈگری کلاسز شروع ہو گئیں۔ سید کرامت حسین نے لکھنؤ میں مسلم گرلز سکول ۱۹۱۲ء میں قائم کیا۔ بعد ازاں مقامی گرلز مسلم طالبات کے لیے انڈسٹریل کلاسز بھی شروع کی گئیں۔

پنجاب

پنجاب میں انجمن حمایت اسلام نے مسلم خواتین کی تعلیم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ انجمن کے تعلیمی پروگرام کے اہم مقاصد میں روایتی اسلامی اقدار کا تحفظ شامل تھا۔ انجمن نے ۱۹۲۵ء میں اینگلو ورنیکر اسلامیہ گرلز مڈل سکول قائم کیا۔ اس کے زیر انتظام

۱۹۳۹ء میں ڈگری کالج قائم ہوا۔[۱۹]

انجمن کے ساتھ ساتھ کچھ مسلم خواتین نے بھی پنجاب میں اہم کردار ادا کیا۔ان میں ایک مثال فاطمہ بیگم کی ہے جو کہ منشی محبوب عالم پیسہ اخبار کے ایڈیٹر کی بیٹی تھیں۔انھوں نے ۱۹۳۹ء میں خواتین کا کالج کھولا۔انھوں نے خواتین کے پردے اور مذہبی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا۔امرتسر پنجاب کا دوسرا بڑا شہر تھا۔جہاں پر مسلم طالبات کی تعلیم پر توجہ دی گئی۔انجمن اسلامیہ نے اس شہر میں اسلامیہ گرلز مڈل سکول قائم کیا۔شہر کی کچھ مسلمان خواتین نے انجمن دارالخواتین اور انجمن اتحاد خواتین جیسی تنظیموں کے ذریعے تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

بہار اور اڑیسہ

بہار اور اڑیسہ میں بھی مقامی مسلمان خواتین میں تعلیم کو پھیلانے کی کوششیں کی گئیں۔نواب رضوی نے پٹنہ میں بادشاہ نواب رضوی گرلز ہائی سکول قائم کیا۔مقامی مسلم خواتین میں بیگم حسین امام ایم۔ایل۔اے کا نام خاص طور پر خواتین کی تعلیمی ترقی کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔۱۹۲۴ء میں انھوں نے ہندوستان ڈے کے موقع پر ہندوستانی خواتین کی لندن میں نمایندگی کی اور انھیں سرکاری طور پر صوبائی Franchise کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔[۲۰]

تعلیمی ترقی کی طرف خواتین کا رجحان

تعلیم کے میدان میں خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد سے تحریک وسیع ہوتی چلی گئی۔کچھ خواتین اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی گئیں۔مسلمان مردوں میں مسلمان خواتین کی تعلیم کے بارے میں بدلتا ہوا رویہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دیکھا جا سکتا ہے۔۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء کے دوران صرف ۳۰ مسلمان طالبات تھیں۔جنھوں نے کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی۔۱۹۲۷ء تک یہ تعداد ۵۳۷ تک ہوگئی۔ان میں سے زیادہ تر طالبات یوپی اور پنجاب سے تعلق رکھتی تھیں۔بعد کے سالوں میں یہ صورت حال مزید بہتر ہو گئی۔ترقی یافتہ صوبوں میں، جس طرح کہ مدراس میں تھا، اگرچہ مسلم طالبات کی تعداد کم تھی لیکن انھوں نے پروفیشنل تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی لی۔۱۹۴۶ء میں بہت سی مسلم خواتین ڈاکٹری کے پیشے سے منسلک ہوگئیں۔جن میں ڈاکٹر نوشابہ ملکار، ڈاکٹر افضل النساء، ڈاکٹر برہان النساء، ڈاکٹر حمیرہ سید، ڈاکٹر کریمہ بیگم، ڈاکٹر امینہ غوری اور ڈاکٹر عابدہ لطیف نمایاں ہیں۔ان لوگوں نے مدراس کے مختلف ہسپتالوں میں کام کیا۔[۲۱]

حیدرآباد کی ریاست بھی مسلمان طالبات کے سلسلے میں ایڈوانس تھی۔زنانہ کالج حیدرآباد میں ریسرچ کی سہولیات جو کہ ایم۔اے اور ایم۔ایڈ لیول پر دی جاتی تھی، کی وجہ سے بہت سی طالبات نے اس میں داخلہ لیا۔۱۹۴۵ء میں بہت سی تحقیقی رپورٹس ایم۔اے اردو اور ایم۔ایڈ لیول پر Submit کروائی گئیں۔

بیرون ملک تعلیم

بہت سی ہندوستانی خواتین اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی گئیں۔حقیقت میں یہ جنوبی ایشیائی معاشرہ میں ایک عظیم انقلاب تھا، جہاں مردوں کی دنیا میں عورت کو غلام سمجھا جاتا تھا اور وہ گھر کی چاردیواری میں مقید رہتی تھی۔بیسویں صدی کے آغاز میں

حکومت نے خواتین کے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف کی سکیم شروع کی۔خاص طور پر لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی خواتین کی رہائش کے لیے ہاسٹل کی سہولیات بھی فراہم کی جاتی تھیں۔سیکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے ایک ہزار پاؤنڈ قرضہ ہاسٹل کی ابتدا کے لیے دیا۔[۲۲]

مسلم خواتین نے بھی بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ابتدائی مثال فیضی Sisters کی نظر آتی ہے، جن میں عطیہ، زہرا اور نازلی شامل تھیں۔بعد ازاں بہت سی مسلم خواتین گورنمنٹ سکالر شپ پر بیرون ملک گئیں۔۱۹۲۶ء میں بیرون ملک خواتین کی حوصلہ افزائی کے لیے برٹش انڈیا کی صوبائی حکومت نے گرانٹ ان ایڈ کی سکالرشپ کی سکیم شروع کی۔بعد ازاں اس سکیم کو دوسری ہندوستانی ریاستوں مثلاً بہاولپور، جوناگڑھ، کشمیر، میسور اور حیدر آباد تک وسیع کی گئی، ریاست حیدر آباد نے کچھ خواتین کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا، جن میں نمایاں بیگم نواب بہادر یار جنگ، بیگم سید جمال الدین اور مس اشرف الحق شامل تھیں۔[۲۳]

پرائیویٹ سیکٹر میں بھی اس سکیم کی حوصلہ افزائی کی گئی، خاص طور پر کئی ٹرسٹ اور ہندوستان کے مخیّر حضرات نے اس میں دلچسپی لی۔بیرون ملک جانے والی طالبات کے تجربات ہندوستانی خواتین کے لیے معلومات کا ذریعہ بن گئے، جو کہ غیر ملکی تہذیب اور معاشرے کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔بعض اوقات ان کے خطوط اور روزانہ کی ڈائریاں کتابوں اور آرٹیکل کی شکل میں شائع کی جاتی تھیں۔

مثال کے طور پر عطیہ فیضی کے تجربات ۱۹۳۲ء میں ''زمانہ تحصیل'' کے ٹائیٹل کی شکل میں شائع ہوئے اور ایک نمایاں مثال محمدی بیگم کی ہے جو مشہور اردو ناول نگار مولانا نذیر احمد کی پوتی تھیں۔انھیں ریاست حیدر آباد کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیجا گیا۔وہ باقاعدگی سے اپنی والدہ کو خطوط لکھتی رہیں جو کہ اردو کے مشہور جریدے عصمت میں شائع ہوتے رہے۔جس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز عورت ہندوستانی عورت کے مقابلے میں زیادہ محنتی ہے۔آخر میں انھوں نے ہندوستانی بہنوں کو نصیحت کی کہ انھیں انگریز عورتوں کو Follow کرنا چاہیے۔[۲۴]

مسلمان عورت عوامی زندگی میں

ہندوستان میں مسلمان خواتین کی تعلیم کی وجہ سے خاص طور پر جدید تعلیم نے بہت سی خواتین کو اس قابل بنا دیا کہ ہندوستانی مسلم معاشرے کی تشکیل اور تعمیر میں اہم کردار ادا کریں۔

غیر نصابی سرگرمیاں

خواتین طالبات کے لیے غیر نصابی سرگرمیاں بھی ان کے تعلیمی اداروں میں حکومت اور مختلف سماجی ایجنسیوں کی مدد سے کی گئیں۔ایک مثال فزیکل ایجوکیشن کا تعارف تھا جو ان اداروں میں شروع کی گئی۔انٹر سکول اور انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ منعقد کروائے جاتے تھے۔فٹ بال اور بیڈ منٹن جیسے کھیل خواتین میں بہت مقبول ہوئے۔[۲۵]

تعلیم یافتہ عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اب سماجی خدمات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں سکولوں میں گرل گائیڈ اور بلیو برڈ کی تنظیمیں متعارف کروائی گئیں۔تمام صوبوں میں طالبات نے ان تنظیموں کا مثبت انداز میں جواب دیا۔ان ایسوسی ایشن کے تحت Camping میں حصہ لیا۔گرل گائیڈ اور بلیو برڈ کا پہلا عوامی مظاہرہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہوا

جب کہ بڑی ریلی ایس۔ٹی جان چرچل پشاور میں منعقد ہوئی اور مقامی سطح پر لوگوں نے اس کو بہت زیادہ سراہا۔[۲۶]

دوسری جنگ عظیم کے دوران ان تنظیموں نے The Women's Auxillary Corps India (WACI) اور دوسری فوجی تنظیموں کی امداد کے سلسلے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

سماجی سرگرمیوں کا پھیلاؤ

اب مسلمان تعلیم یافتہ خواتین نے وسیع پیمانے پر صحافت نثر نگاری اور شاعری کی کتابوں میں لکھنا شروع کر دیا۔انیسویں صدی کے آخر میں بہت سے شعرا دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ سے وابستہ تھے۔تاہم ان کا زیادہ تر رجحان رومانی اور مزاحیہ شاعری کی طرف رہا اور خاص طور پر خواتین کے بارے میں کوئی بات نہ کہی گئی۔بیسویں صدی میں نئی تبدیلی آئی اور اب سماجی مسائل ان کی شاعری کا موضوع بنے۔اس سلسلے میں ایک اچھی مثال حیدرآباد کی نوشابہ خاتون قریشی کے شاعرانہ کام کی ہے۔اس کی نظمیں تحریک خلافت کے دوران مسلمان خواتین میں بہت مقبول ہوئیں۔بعد ازاں اس کی نظموں کا مجموعہ ''موج تخیل'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔[۲۷]

شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلم خواتین نے مذہبی، سماجی اور تاریخی ایشوز پر قلم اٹھایا۔ابتدائی مثال بیگم آف بھوپال کے کام کی ہے۔مزید برآں اس میدان میں محمدی بیگم ایڈیٹر آف تہذیب نسواں، طیبہ بیگم بلگرامی اور خجستہ سلطان بیگم سہروردی نے نمایاں کام کیا۔بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں مڈل کلاس خاندان کی بہت سی تعلیم یافتہ خواتین نے بھی اپنے سماجی تجربات تحریروں کی صورت میں پیش کیے۔

ریڈیو؛ ذریعہ ابلاغ

اسی طرح ریڈیو بھی ابلاغ کا بہت بڑا ذریعہ تھا، جہاں سے تعلیم یافتہ خواتین نے اپنی بہنوں کے لیے پروگرام پیش کیے۔ ۱۹۴۴ء میں ایک اور بڑا اقدام اٹھایا گیا، بیگم شاہ نواز کی زیر نگرانی انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ کے شعبے میں خواتین کا سیکشن شروع کیا گیا، جہاں سے خصوصاً طور پر فیچر، مباحثے اور کھانا پکانے کی ترکیبوں کے پروگرام خواتین کے لیے نشر کیے جاتے تھے۔آل انڈیا کے ریڈیو کے مختلف سٹیشنوں مثلاً دہلی، لاہور، لکھنؤ، پشاور، بمبئی، مدراس اور حیدرآباد سے خواتین کے لیے اردو میں پروگرام پیش کیے جاتے تھے، جو تعلیم یافتہ مسلم خواتین پیش کرتی تھیں۔[۲۸]

پیشہ ورانہ سٹیٹس

ہندوستانی خواتین کا پیشہ ورانہ سکوپ خاص طور پر ٹیچنگ کے میدان میں بتدریج بڑھتا گیا۔اس سلسلے میں مزید تقویت عورتوں کی ٹیچنگ سروس کے لیے ۱۹۱۷ء میں ہندوستان میں رائل کمیشن آف پبلک سروس کمیشن کے قیام سے ہوئی۔کمیشن نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خواتین کے لیے محکمہ تعلیم میں انسپکٹرس، سب انسپکٹرس اور پرنسپل کے لیے کلاس ون اور کلاس ٹو کی ۴۲۶ آسامیاں مشتہر کیں۔[۲۹]

۱۹۲۰ء میں ایک اور قدم ڈپٹی ڈائریکٹرس آف پبلک انسٹرکشن کی آسامی میں مدراس پریذیڈنسی میں Create کر کے اٹھایا

گیا۔بعدازاں اس قسم کی پوسٹیں بمبئی پریذیڈنسی اور پنجاب میں بھی قائم ہوئیں۔[۴۰]

۳۹۔۱۹۲۸ء میں مختلف صوبوں میں کئی خواتین انسپکٹرس تعینات ہوئیں۔یہ اپنے علاقہ میں خواتین کی تعلیم سے متعلقہ مسائل کے بارے میں ذمہ دار تھیں۔مسلمان تعلیم یافتہ خواتین نے دوسری ہندوستانی بہنوں کے لیے دوسرے شعبوں کے برعکس تعلیم کے شعبے کو ترجیح دی۔اس سے پہلے وہ دوسرے شعبوں میں بھی جو کہ مردوں کے لیے مخصوص تھے نظر آتی ہیں،مثلاً میڈیسن اور بینکنگ کے شعبے میں شیریں پہلی ہندوستانی مسلمان خاتون تھیں،جنھوں نے ایم۔بی۔بی ایس۔کی ڈگری لی۔۱۹۳۴ء میں بیگم میوزادہ پہلی مسلم خاتون ایڈووکیٹ تھیں،جنھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں ۱۹۴۱ء میں پریکٹس شروع کی اور زبیدہ صفدر احمد پہلی ہندوستانی مسلمان بینکر خاتون تھیں،جنھوں نے بینکنگ میں اعلیٰ تعلیم ۱۹۴۴ء میں یو۔ایس۔اے سے حاصل کی۔اس طرح بعد کے سالوں میں ہمیں مختلف شعبوں میں خواتین کام کرتی نظر آتی ہیں۔[۴۱]

تعلیم نسواں کے مسلم معاشرے پر اثرات

تعلیم نسواں کے مسلم معاشرے پر زبردست اثرات مرتب ہوئے۔خواتین میں تعلیم سے سیاسی شعور بڑھا۔عورتیں اپنے حقوق سے آگاہ ہوئیں۔مسلم معاشرے کے مرد اس بات سے آگاہ ہو گئے کہ اگر ہم نے ترقی کرنی ہے تو تعلیمی میدان میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ آگے لانا چاہیے۔چوں کہ مسلمان اور بہت سے ایسے ادارے جو تعلیم میں انگریزی زبان اور اردو زبان دونوں کو فروغ دے کر ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔اس کے نتیجے میں اینگلو اردو سکول وجود میں آئے اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ان اداروں سے مسلم خواتین نے جو بھی تعلیم حاصل کی،جس سے مسلمانوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔خواتین پیشہ ورانہ میدان میں آگے آئیں۔عورتوں نے بہت سے اخبارات میں آرٹیکلز لکھے،جن میں عورتوں کے مسائل کو بیان کیا گیا۔پڑھی لکھی عورتوں نے مختلف ایسوسی ایشنز کو اپنایا،اس میں سرِفہرست انجمن خواتین دکن قائم ہوئی۔ہندوستان میں تعلیم عام کرنے میں سوشل ریفارمرز کا بہت ہاتھ تھا کیوں کہ انھوں نے اداروں کے لیے مالی امداد فراہم کی۔بدرالدین طیب جی اور ان کی بیٹی عطیہ فیضی نے انجمن اسلامیہ بمبئی میں قائم کی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ باٹنی اور زوالوجی اردو میں پڑھائی جائے۔اخبار''جبل المتین''میں ان تمام مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔انفرادی طور پر کوششیں کرنے والوں میں شیخ عبداللہ علی گڑھ،حسین کرامت حسین لکھنؤ،بیگم امیرالدین مدراس،بیگم حسن امام بہار سے ان لوگوں نے اعلیٰ سطح پر تعلیمی ترقی کے لیے کام کیا۔ان کا مقصد تھا کہ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلائی جائے۔وہ مختلف اداروں کو اپنائیں اور تعلیم کے میدان میں اپنے آپ کو منوائیں پیشہ ورانہ تعلیم کے فروغ میں متوسط طبقے کا بہت ہاتھ ہے کیوں کہ اس طبقے کو بہت سے مسائل درپیش تھے،اس لیے خواتین نے استاد،ڈاکٹر اور نرس بننے کو ترجیح دی تاکہ وہ اقتصادی طور پر مستحکم ہوں۔

حاصل بحث

تعلیمی میدان میں خواتین کی آمد مسلم معاشرے کے لیے بہت بڑی نوید تھی۔تاریخ میں عورت کی جو تصویر ابھر کر آتی ہے،وہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ ان تمام نشیب وفراز اور مرد کے اقتدار و طاقت کے باوجود عورت نے شکست تسلیم نہ کی۔اگرچہ اسے کچلا گیا،دبایا گیا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی بقا کی جنگ لڑی اور تاریخ میں ایک طاقت کی حیثیت سے خود کو برقرار رکھا۔اس کی مثال ان عورتوں سے دی جاتی ہے جنھوں نے تعلیم کی اعلیٰ قدروں کو چھوا اور خود کو بحیثیت سپہ سالار،سربراہ مملکت،ادیبہ و شاعرہ و فنکارہ کے طور

پر تسلیم کروایا حالاں کہ وہ مردوں کی دنیا تھی مگر عورت پھر بھی اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب رہی۔

تعلیم سے خواتین میں جہالت کا خاتمہ ہوا۔ خواتین میں معاملہ فہمی اور گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کا شعور پیدا ہوا، جسمانی تعلیم کے فروغ سے خواتین کی صحت میں بہتری ہوئی۔ اس سے خواتین میں اتحاد پیدا ہوا۔ تعلیم سے خواتین ادبی اور سماجی میدان میں آئیں جس سے خواتین نے بھی قوانین کے مسائل اور مشکلات کو ادبی قرطاس پر ظاہر کیا۔ تعلیم نسواں سے خواتین فوجی تربیت اور دیگر پیشہ وارانہ میدانوں میں آئیں۔ تربیت حاصل کرنے کے بعد خواتین عملی میدانوں میں آئیں، مختلف تنظیموں کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت کی۔ تعلیم نسواں میں پیش رفت سے مسلم خواتین میں سیاسی شعور بیدار ہوا، جس سے انھوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

Refrences

۱۔ Gail Minault, The extended family as a Metaphore and the expansian of women's realm, in Gail Mindault (ed) The extended family, women's political participation in India and Pakistan, South Asia Book, Columbia, 1938. pp3-18

۲۔ Ibid P-18

۳۔ Memorandum on the progress of education in British India between 1916-26, Government Printing, Calcutta, 1927, P-59.

۴۔ Ibid P-59

۵۔ Progress of education in India Ninth Quinquennial Report Vol.2 Govt. of India Calcutta 1929. P-242

۶۔ Ibid P-243

۷۔ Sir Philip Hartog, Notes and Memoranda on the growth of woemen's Education in India 1929, Mss. EUR. E. 221 India office librarys records, London,P-2.

۸۔ Progress of Education in India, 1927-32 Tenth Quinquennial Review (Govt. of India Calcutta, 1934.) P-184.

۹۔ Progress of Education in India, Eleventh Quinquennial Review (Govt. of India, press Simla, 1938.) P-241.

۱۰۔ Report of the second wardha Education Committee, Central advisory board of Education, Govt. of India press, New Delhi 1941. P-15.

۱۱۔ Annual report on the public Instruction in the N.W.F.P. for the year 1938 Government of the N.W.F.P, Peshawar, 1940. P-63.

۱۲۔ Report on the state and progress of Education in the Central provinces and Berar for 1941-42. (Govt. Printing press Nagpur, 1942) P-44.

۱۳۔ N. Kraemer, Islam in India today, Muslim world, vol xxi, New Jersey 1931, P-151-76.

۱۴۔ Progress of Education in India, Tenth Quinquennial Review PP-208-20.

۱۵۔ Sarfraz Hussain Mirza Muslim Women's Role in the Pakistan movement, Research Society of Pakistan, University of the Punjab Lahore, 1969, P-12.

۱۶۔ Naseeruddin Hashmi, Hyderabad Ka Zenana College, Ismat, Vol. 66 No.1 January 1941, P-46-48.

۱۷۔ Nasreeuddin Hashmi, Madras Ki Ala Talim Yafita Khawateen Ismat, March 1946. Pp-194-95.

۱۸۔ Ismat, Vol. 62 No.2, February 1939. PP 442-43.

۱۹۔ Fatima Begum, Muslim Ladies Conference Aur Zenana Sanati Namaish, Ismat, Vol.48 No.2, February 1932, PP-144-45.

۲۰۔ Ismat, Vol 64. October 1941, P.251.

۲۱۔ Nasreeuddin Hashmi, Madras Ki Ala Talim Yafita Khawateen Ismat, PP-194-95.

۲۲۔ Report of the Indian Students department for April 1920 to March 1923, office of the Commission for India, His Majestry's stationary office, London 1923, P-19.

۲۳۔ Nasreeuddin Hashmi, Hyderabad Ki European Talim Yafita Khawateen "Ismat" vol.74, No.4 September 1945. PP-243-44.

۲۴۔ Ismat, vol.55, No.3 September 1935 PP-255-56.

۲۵۔ Begum Abdul Rashid " Nazakat Aur Chusti ki Jang" Ismat, vol 51,No.6. December 1933, PP-471-72.

۲۶۔ Report on the public instruction in N.W.F.P. in 1938, P-73.

۲۷۔ Ismat, vol.71, No.1, January 1943, PP-37-40.

۲۸۔ Nasreeuddin Hashmi, Hyderabad Ki European Talim Yafita Khawateen "Ismat" January 1943. PP-37-40.

۲۹۔ Royal Commission on the public service in India, His Majesty,s stationary office, London 1917, PP-119-20.

۳۰۔ Ibid, PP119-20.

۳۱۔ See the detail progress of Education in India Eighth Quinquennial Review P.165 Ninth Quenquennial review, P-30, Tenth Quinquennial Review, P-32. Eleventh Quinquennial Review, P-34 and education in India, P-51.

ضیا محمد ضیا کے خطوط راقم کے نام

ڈاکٹر محمد سرور رانا

دل شاد پسروری[1] کے شہر کے باسی اور اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر، ادیب اور نکتہ رس محقق ضیا محمد ضیاء الہاشمی نے فارسی کے عظیم شاعر غنیمت کنجاہی کے مولد و مسکن کنجاہ ضلع گجرات کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں "چوہا مل" میں ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو جنم لیا۔ آبا و اجداد کا مشغلہ تعلیم و تدریس اور تبلیغ و ارشاد تھا۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنا تعارف بزبانِ سعدی یوں کر دیا تھا:

همه قبیلهٔ من عالمانِ دین بودند
مرا معلمِ عشق تو شاعری آموخت

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۴۴ء میں انھوں نے بطور استاد السنۂ شرقیہ اپنی معلمانہ زندگی کا آغاز کنجاہ کے اسلامیہ ہائی سکول سے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور گورنمنٹ ہائی سکول پسرور ضلع سیالکوٹ میں متعین ہوئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۱۹۸۸ء میں ملازمت سے ریٹائر اور ۲۰۰۸ء میں اسی شہر میں آسودۂ خاک ہوئے۔

ضیا مرحوم کو شعری ذوق قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں اردو اور فارسی میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں دو مرتبہ سید اولاد حسین بلگرامی سے بذریعہ خط و کتابت شعر فارسی میں اصلاح لی لیکن اس کے بعد اپنے ذوق اور وجدان پر انحصار کیا۔ اردو اور فارسی میں تحقیقی مضامین لکھے۔ نیز ہر دو زبانوں میں مندرجہ ذیل مجموعے شائع کیے:

فارسی

۱۔ ارمغانِ عشق (نعتیہ کلام) ۱۹۷۰ء مقدمہ از ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی۔

۲۔ نوای شوق: ۱۹۷۷ء (قصاید، غزلیات، مثنویات، قطعات و ترانہ ھادی میھنی و مادۂ تاریخ) بہ کوشش و پیش گفتار آقای محمد حسین تسبیحی، تعارف: ڈاکٹر علی اکبر جعفری بنام "صہبای سخن ضیا"، مقدمہ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی، احوال و سبک و آثار پر مشتمل دو صفحات کا مختصر مضمون بعنوان "ضیاء کنجاہی" ڈاکٹر سبط حسن رضوی نے لکھا جو کتاب میں شامل ہے۔

۳۔ کاروانِ فارسی: ۱۹۷۵ء میں چند ایرانی علما اور ادبا فرہنگی دورے پر پاکستان تشریف لائے تو ضیا نے ان کے خیر مقدم نیز پاکستان میں ان کی مصروفیات کے بارے میں متعدد نظمیں لکھیں جو "کاروانِ فارسی" کے نام سے شائع ہوئیں۔

---

[1] اٹھارھویں صدی عیسوی کے ایک صاحب دیوان فارسی شاعر

ضیا کے فارسی کلام میں مطالب کا تنوع، پختگی، شیرینی اور سلاست بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ زبان و بیان کی لطافتیں اور فن کی باریکیاں سبھی کچھ ہے، جس کا اعتراف اہلِ زبان ادیبوں اور نقادوں نے بھی کیا ہے۔ معروف ایرانی سکالر ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی نے ''فارسی پاکستانی'' جلد دوم میں، ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے ''پاکستان میں فارسی ادب'' میں اور ڈاکٹر سید سبطِ حسن نے ''فارسی گویان پاکستان'' میں ان کا ذکر کیا ہے جب کہ مشہور ایرانی شاعرہ سیمین بہبہانی نے ان کی شاعری کو سراہا ہے۔

اردو شاعری

۱۔ موجِ زمزم (حمد و نعت) ۱۹۹۵ء

۲۔ متاعِ سخن (قومی نظمیں) ۲۰۰۶ء

۳۔ یادِ رفتگان کے نام سے رثائی منظومات کا ایک مجموعہ ۲۰۰۲ء

آپ نے دونوں زبانوں میں بے شمار تحقیقی مضامین بھی لکھے جو پاکستان اور ایران کے ادبی مجلوں میں شائع ہوئے، ان میں سے چند ایک کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ دل شاد پسروری

۲۔ زیرک کلانوری اور اس کی مثنوی ''ارژنگِ عشق''۔ اس مقالے کو ڈاکٹر محمد باقر نے اپنی تالیف ''پنجابی قصے فارسی زبان میں'' جلد اول میں شائع کیا۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالرحمٰن عرفانی نے اپنی تالیف ''داستان ہای عشقی پاکستان'' میں اس مقالے سے استفادہ کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا۔

۳۔ مقالہ سسی پنوں

۴۔ مولانا عظامی

۵۔ اقبال عرفانی از عبدالحمید عرفانی کی تدوین و ترتیب اور اشاعت

۶۔ کلام نفس ۱۹۸۳ء۔ یہ تالیف مولوی الف دین نفیس کے احوال و آثار پر مشتمل ہے۔ جو ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کے حقیقی تایا تھے۔ یہ وہی مولوی الف دین ہیں جن کی تصنیف ''مثنوی معارف اسلام'' پر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے تقریظ لکھی تھی اور مندرجہ ذیل لاجواب شعر کی صورت میں داد دی تھی:

الف دین نے ایک لکھی کتاب　　　کہ بے دین نے پائی راہِ صواب

ادیب و استاد شہیر طاہر شادانی کے تعاون سے مندرجہ ذیل اردو کتب مرتب اور شائع کیں۔

۱۔ موجِ صبا: فاخر ہریانوی کا مجموعہ کلام

۲۔ گلدستہ سعدی: تالیف حکیم محمد حسین علوی کی تصحیح و نظر ثانی

۳۔ خزینہ معارف: قرآن مجید، احادیث، مصلحین، مفکرین اور مصنفین کے اقوال زریں پر مشتمل مجموعہ۔

۴۔ نوادراتِ سخن: اردو کے شعری و ادبی لطائف و ظرائف

۵۔ گلدستۂ نعت: اردو کی بلند پایہ نعتوں کا انتخاب

۶۔ حمد و مناجات: اردو کی حمدیہ منظومات کا انتخاب

سطور بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ضیا محمد ضیا ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ فارسی کی آبرو اور اردو کی شان تھے اور ان سب سے بڑھ کر اگلے وقتوں کی شرافت اور وضع داری کا بہترین نمونہ تھے۔

راقم ۱۹۵۸ء میں بطور استاد گورنمنٹ ہائی سکول پسرور آیا تو ضیا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ''آتش'' جواں بلکہ نوجوان تھا۔ ع: دل میں ولولہ تھا اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ بھی۔ سوچا ایم اے کیا جائے۔ مضمون کا انتخاب کوئی مسئلہ نہ تھا کہ فارسی کا ذوق ورثے میں ملا تھا چناں چہ مطالعہ شروع کر دیا۔ لاہوری احباب کی مہربانی سے نصابی کتب مل جاتی تھیں لیکن مشکل تب پڑی جب اردو سے فارسی میں ترجمہ اور اس کی اصلاح کا مرحلہ آیا۔ ادھر ادھر نظر ڈالی لیکن پسرور جیسی دور افتادہ جگہ پر کوئی ایسی علمی و ادبی شخصیت نظر نہ آئی جس سے مدد لی جا سکے۔ بعض رفقا نے مشورہ دیا کہ میں السنۂ شرقیہ کے استاد ضیا محمد ضیا صاحب سے ملوں لیکن دل نہیں مانتا۔ بھلا ایک ایسا شخص جس نے محض انٹرمیڈیٹ کی سطح تک تعلیم پائی ہو کس طرح میری رہنمائی کر سکتا تھا۔ یہ میرا ''دورِ جاہلیت'' تھا جب میں قابلیت کو ڈگریوں کے پیمانے سے ماپتا تھا۔ سچی بات ہے طوعاً و کرہاً گیا لیکن جب انھیں نے اصلاح دی تو یقین جانیے ایسا انشراحِ صدر ہوا کہ باید و شاید۔ ذہن کے کتنے ہی تاریک گوشے روشن ہو گئے بس اس دن سے میں نے ہمیشہ کے لیے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔

من بہ سر منزلِ عنقا نہ بخود بردم راہ
قطعِ این مرحلہ با مرغِ سلیمان کردم

رفتہ رفتہ ان سے ایسا قلبی تعلق قائم ہوا کہ مرورِ زمان اور بعدِ مکان بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے، ان کی طرف سے شفقت و محبت اور بندہ کی طرف سے نیازمندی کا سلسلہ ان کے سانحۂ ارتحال تک قائم رہا۔

۱۹۶۲ء میں میرا تقرر گورنمنٹ کالج ساہیوال (سابق منٹگمری) میں ہو گیا۔ اس کے بعد مدتوں پنجاب کے مختلف کالجوں میں فارسی زبان و ادب کی تدریس میں مصروف رہا۔ ملک سے باہر بھی رہا لیکن کبھی کبھار ضیا صاحب سے ملاقات کے مواقع نکل ہی آتے تھے۔ میرا غریب خانہ پسرور کے نزدیک نارووال میں تھا۔ لہٰذا ان سے ملنے میں آسانی تھی۔ ضرورت پڑنے پر خط و کتابت بھی ہو جاتی تھی۔ انھوں نے متعدد خطوط لکھے لیکن اِدھر اُدھر تبادلوں کی وجہ سے بہت سے خطوط ضائع ہو گئے۔ ان کی عمرِ عزیز کے آخری دو چار سالوں میں لکھے گئے چند خطوط محفوظ رہے جو آیندہ صفحات میں نذرِ قارئین ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں جہاں ان کی خوبصورت شخصیت جھانکتی نظر آتی ہے وہاں حسنِ بیان بھی دل کو موہ لیتا ہے۔ بقول داغ:

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی

اب یہ کہنے کا ہنگام تو نہیں رہا کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

تاہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جو کلام وہ یادگار چھوڑ گئے ہیں وہ نہایت توانا اور فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ (استفادہ: راقم کا مضمون ''شاعر رنگین نوا، ضیا محمد ضیا'' مجلّہ کاوش ۱۹۹۶ء)

نوٹ: ان اوراق میں شامل ضیا محمد ضیا کا آخری خط جناب قاضی عطاءاللہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے کیوں کہ وہ خود ان دنوں ضعف کے باعث لکھنے سے معذور رہتے۔

پسرور

۲۱ اگست ۹۵ء

محبّ محترم رانا صاحب السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ اور مجلّہ ''کاوش'' کوئی دو ہفتے پیش تر موصول ہوئے تھے، نوازشات کے لیے شکر گزار ہوں۔ آج اکیس اگست ہے اور آپ کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق آپ کی سرکاری ملازمت کا آخری دن۔ جدائی کی یہ گھڑی اور بِرہ کی یہ کڑی ساعت سات آٹھ برس پہلے مجھ پر بھی آئی تھی مگر ملائم ہو گئی۔ قافلے سے بچھڑنے اور ہمرہان قافلہ کا ساتھ چھوٹنے کا اندوہ ضرور تھا مگر اس بات کی خوشی بھی تھی کہ مدت ملازمت عزت و آبرو اور خیر و عافیت کے ساتھ پوری ہو گئی۔ زنجیر غلامی ٹوٹی، اب جی کھول کر 'آزادی' کے مزے لوٹیں گے۔ گھر میں آرام کریں گے اور اطمینان کے ساتھ اوراق پریشاں کی شیرازہ بندی کریں گے۔ امید ہے آپ نے بھی یہ مرحلہ ہنسی خوشی طے کیا ہوگا۔ فرصت اور فراغت آپ جیسے صاحب قلم اور مطالعہ و تحقیق کا ذوق رکھنے والے شخص کی بنیادی ضرورت ہے جو اب آپ کو وافر میسر آئے گی، اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بازنشستگی کے ثمرات و فوائد سے بیش از بیش متمتع ہونے کا موقع عطا فرمائے۔

میری ریٹائرمنٹ کے موقع پر میرے ایک بہت پرانے شاگرد نے (جو خود بھی اب ریٹائر ہونے والا ہے اور بڑا صاحب ذوق ہے) یہ دلچسپ بات لکھ کر میری حوصلہ افزائی کی تھی کہ اگرچہ آپ کی عمر ساٹھ برس ہو گئی ہے مگر اپنے آپ کو بڑھاپے کا احساس نہ ہونے دیں کیوں کہ ''سٹھیانا'' یا ''سٹھیا جانا'' یوپی والوں کی زبان ہے، ہم اہل پنجاب بوڑھوں کے لیے ''سترے بہترے'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لہٰذا آپ مزید دس بارہ برس تک اپنے آپ کو ہرگز بوڑھا تصور نہ کریں بلکہ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کہنے والوں کے زمرے میں شامل سمجھیں، میں آں عزیز کی اس نکتہ آفرینی سے بہت محظوظ ہوا۔

''کاوش'' بہت معیاری جریدہ ہے۔ آپ حضرات نے اپنی مسلسل محنت اور کد و کاوش سے اسے صفِ اول کا علمی اور تحقیقی مجلّہ بنا دیا ہے۔ بالخصوص آپ کے اپنے مقالات تو اس پرچے کی جان ہوتے ہیں۔ ''قلمی نسخوں کی تدوین''، ''فائز اور اس کی غزلیات'' اور حالیہ شمارے میں ''خزانۃ الفواید الجلالیہ'' جیسے مقالات آپ کے دقیق اور عمیق مطالعہ اور ذوقِ تحقیق و تجسس کا پتا دیتے ہیں۔ میں آپ کے عالمانہ ذوق اور شگفتہ اسلوبِ تحریر سے بہت متاثر ہوں۔

افسوس کہ ''کاوش'' پہلے آپ کے فاضل پیشرو جناب پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی مدیریت سے محروم ہوا اور اب ایک ہی شمارہ مرتب کرنے کے بعد آپ بھی اسے الوداع کہہ رہے ہیں۔ خدا کرے اس کے ساتھ آپ کا اعزازی تعلق آیندہ بھی برقرار رہے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ یہ عریضہ ایسے وقت لکھوں کہ ۲۱ر اگست سے پہلے پہلے آپ تک پہنچ جائے مگر مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ عام طور پر سبکدوش ہو جانے والے ملازمین کی ڈاک کچھ عرصہ بعد تک ان کے سابقہ پتے پر آتی رہتی ہے، خدا کرے میرا یہ خط بھی بحفاظت آپ تک پہنچ جائے۔

براہ کرم ایک تو اس خط کی رسید ضرور دیں تا کہ اطمینان ہو جائے کہ خط آپ کو مل گیا ہے، دوسرے یہ تحریر فرمائیں کہ اگر ''نوای شوق'' کا کوئی نسخہ ادھر اُدھر سے ہاتھ آ جائے تو کس پتے پر ارسال خدمت کروں یعنی اپنے آیندہ پوسٹل ایڈریس سے بھی مطلع فرمائیں۔ والسلام مع الاکرام۔

آپ کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو

ضیا محمد ضیاء

پسرور

۱۷ر اکتوبر ۹۵ء

محب محترم رانا صاحب السلام علیکم

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کا نوازش نامہ کافی پہلے ملا تھا، میں ادھر ادھر سفر میں رہا اس لیے رسید نہ دے سکا، معذرت خواہ ہوں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ملازمت کی گراں بار ذمہ داریوں سے بخیر وخوبی سبکدوش ہو گئے، تاہم میرا خیال ہے کہ اگر کالج کی طرف سے کوئی پیشکش ہو رہی ہے تو اس پر غور کر لینا چاہیے۔ اس طرح اپنے حلقۂ احباب سے تعلق بھی رہے گا اور وقت گزاری کی صورت بھی بن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اب یہ پابند ضوابط قسم کی ملازمت نہیں ہو گی بلکہ ایک اعزاز یہ ہو گا جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔

میں نے حسب الارشاد ''نوای شوق'' کی ایک کاپی ہفتہ عشرہ پہلے بصیغہ رجسٹری ارسال خدمت کر دی تھی، امید ہے مل چکی ہو گی۔ رسید سے ضرور مطلع فرمائیں۔ یہ مجموعہ میری ذاتی نگرانی کے بغیر شائع ہوا، اس میں بہت سی کتابت کی اغلاط ہیں۔ تبویب میں بھی گڑ بڑ ہے۔ کئی کمزور اشعار جنھیں میں خارج کر چکا تھا، شامل ہو گئے اور بعض اچھی چیزیں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ خدا کرے اشاعت ثانی کی نوبت آئے اور میں نظر ثانی اور ان جملہ خامیوں کی اصلاح کر سکوں۔

کتاب کی رسید سے ضرور نوازیں۔

آپ کی خیر وعافیت اور صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہوں اور ملاقات کا متمنی ہوں۔ والسلام مع الاکرام

خیر طلب

ضیاء الہاشمی

پسرور

۱۰ اپریل ۹۷ء

باسمہ

برادرِ گرامی قدر رانا صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، محبت واخلاص کے پاکیزہ جذبات سے لبریز آپ کے دونوں نوازش نامے موصول ہو چکے ہیں۔ ان خطوط کا ایک ایک لفظ آپ کے بے پایاں خلوص کا مظہر ہے، اللہ کریم آپ کو سلامت رکھے، میں گذشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے پابہ سفر صبح وشام کی عملی تفسیر بنا ہوا ہوں، آج قدرے یکسوئی سے بیٹھنے کا موقع ملا تو یہ چند سطور لکھنے کی ہمت کی ہے مگر دل شرمندگی کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ سوچتا ہوں آپ کی بے لوث محبتوں کا شکریہ کس طرح ادا کروں اور آپ کو طویل انتظار کی جو کوفت برداشت کرنی پڑی ہے، اس پر معذرت کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ آپ کا تو عذر بھی بے حد معقول تھا پھر بھی دیر سے خط لکھنے کی معذرت ایسے پیرائے میں کی کہ میں خود شرمسار ہو گیا۔ بہرحال اپنی نادانستہ کوتاہی کے لیے تہ دل سے معذرت خواہ ہوں، امید ہے کھلے دل سے معاف فرمادیں گے۔

حرمین شریفین میں دوبارہ حاضری کی سعادت ملنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمایئے، اندرون خانہ بھی تہنیت پہنچا دیجیے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ میرے اور آپ کے حالات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دو ڈھائی برس پہلے میری اہلیہ کو بھی ایک میجر اپریشن سے گزرنا پڑا، ان کا اصرار تھا کہ سفرِ مقدس پر جب بھی جاؤں انھیں لازماً ساتھ لے کر جاؤں، دینی اور علمی ذوق سے بفضلہٖ تعالیٰ بہرہ ور ہیں۔ چناں چہ ہم دونوں عمرے کے شرف سے مشرف ہوئے تھے اور اب دوبارہ حاضری کے لیے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ دعا کیجیے اللہ کریم ہمیں بھی آپ کی طرح دوبارہ یہ سعادت عطا فرمائے، زوجین کی ہم خیالی، ہم ذوقی اور ذہنی وفکری ہم آہنگی بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

آپ کے جسمانی عوارض کی تفصیل پڑھ کر بہت تشویش ہوئی تاہم مقامِ شکر ہے کہ اب بحیثیت مجموعی آپ کی صحت بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مع اہل وعیال صحت وسلامتی سے شادکام رکھے۔

مجھ ہیچ مدان کو آپ نے اپنی قلمی نوازشات کے لائق سمجھا۔ یہ آپ کی عظمت اور عالی ظرفی ہے ورنہ میں کیا چیز ہوں، آپ کا لکھا ہوا قابلِ قدر مضمون میں نے بغور پڑھ لیا ہے اور حسبِ ارشاد کہیں کہیں کوئی ضروری ترمیم بھی کر دی ہے، آپ کا یہ گراں قدر مقالہ ہماری دوستی، یگانگت اور محبت ومودت کی یادگار کے طور پر ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔

کرم کرد ے الٰہی شاد باشی

جواب میں تاخیر کے لیے ایک بار پھر دلی معذرت۔

رسید کا منتظر رہوں گا، خورد وکلاں کو درجہ بدرجہ دعا وسلام۔ والسلام مع الاکرام

نیازمند

ضیاء محمد ضیاء

پسرور

۱۵جون ۹۷ء

برادرعزیز ومکرم رانا صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا نوازش نامہ کم وبیش ایک ماہ پہلے موصول ہوا تھا، میں اس کی رسید جتنی جلدی دینا چاہتا تھا، افسوس کہ اتنی ہی زیادہ تاخیر واقع ہوگئی۔ جس پر میں سخت نادم ہوں۔ اس غیرارادی تاخیر کا سبب یہ ہے کہ جسمانی اور ذہنی توانائیاں تو پہلے جیسی رہیں نہیں مگر بے ہنگم مصروفیات کافی بڑھ گئی ہیں۔

ے ایک گھٹنے سے جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

جس قلم کو زندگی بھر ہاتھ سے نہیں رکھا تھا اب اسے اٹھاتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ امید ہے معذرت قبول فرمائیں گے۔

مقالے کی صورت میں آپ نے احقر کی جو قدر افزائی فرمائی ہے اس کے لیے ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ یہ گراں قدر مقالہ مجھ ناچیز کے ساتھ آپ کے گہرے قلبی تعلق کا عملی ثبوت ہے اور آپ کے سنجیدہ علمی اور تحقیقی ذوق کا آئینہ دار بھی، خودپسندی اور انا پرستی کے اس دور میں ایسا خلوص اور ایسی بے لوث محبت کہاں ملتی ہے، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

''کاوش'' کے لیے چشم براہ ہوں۔ یہ جریدۂ فریدہ اپنے مستقل قارئین کے ہاتھوں میں تو جائے گا ہی، کیا کوئی زائد کاپی بھی مجھے مل سکے گی (قیمتاً ہی سہی) تا کہ آپ کا ہدیۂ محبت بعض دوسرے علم دوست احباب کو بھی دکھا سکوں، کیوں کہ:

حیف بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نرسد

(اس سلسلے میں متعلقہ احباب کے پوسٹل ایڈریس بھی دیے جاسکتے ہیں)

دو تین ماہ پہلے آپ نے اپنے جسمانی عوارض کی جو تفصیل بیان فرمائی تھی، وہ خاصی پریشان کن تھی لیکن اپنے تازہ خط میں اپنی صحت کی جو موجودہ صورت حال آپ نے بتائی ہے اسے پڑھ کر دلی اطمینان ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ بخیر وعافیت رکھے اور آپ کے جملہ متعلقین کو بھی، آپ کی پیش کش سے ان شاء اللہ کبھی نہ کبھی ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں آپ کی گاڑی کی 'صحت' اور سلامتی کے لیے بھی دعا گو ہوں۔

''موجِ زمزم'' کے بارے میں آپ مجھے کلماتِ تحسین سے نوازتے رہتے ہیں، آپ جیسے سخن شناس دوست کی داد میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کے لیے شکرگزار ہوں، اگر ایک زائرِ حرم کے شوقِ زیارت کو مہمیز کرنے میں میرے ناچیز اشعار کا تھوڑا بہت حصہ بھی شامل ہو تو اس سے بڑی سعادت کی بات میرے لیے اور کیا ہوسکتی ہے، میں خود بھی ''نغماتِ حرم'' کو اکثر پڑھتا اور اللہ کریم سے ''ایں کرم بارِ دگر کن'' کی دعا والتجا کرتا رہتا ہوں کیوں کہ آنکھیں بدستور پیاسی ہیں۔

''یادِ رفتگاں'' اور ''متاعِ سخن'' کی مبارک باد کا شکریہ، دعا کیجیے ان کی اشاعت کی کوئی سبیل نکل آئے۔

دل شاد پسروری بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کا شاعر تھا۔

خط کافی طویل ہوگیا ہے، معذرت کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

عزیزان کو دعوات صالحہ۔ والسلام مع الاکرام

نیازمند

ضیا محمد ضیاء

باسمہ تعالیٰ

پسرور

۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۷ء

برادر عزیز و مکرم رانا صاحب سلام مسنون

قاصد سید و نامہ رسید و خبر رسید
در حیرتم کہ جاں بہ کدامیں کنم نثار

گرامی نامہ ملا اور ''کاوش'' کی چار کاپیوں کا رجسٹرڈ پیکٹ بھی، دوگونہ عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ آپ کی عظمت ہے کہ مجھ ناچیز کو اتنی اہمیت دی اور حسن ظن کریمانہ کا مستحق سمجھا ورنہ من آنم کہ من دانم، آپ کا گراں قدر مقالہ آپ کی علم دوستی، ادب نوازی اور سخن شناسی کا مظہر ہے اور راقم سے آپ کی بے لوث محبت اور گہرے قلبی تعلق کا آئینہ دار بھی۔ انا پرستی کے اس دور میں ایسی مثالیں نایاب ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت با کرامت رکھے۔

اشعار میں جیسا کہ آپ نے خود بھی تحریر فرمایا ہے کہیں کہیں کتابت کی کوئی غلطی راہ پا گئی ہے جو معمول کی بات ہے۔ خوش نویس حضرات بالخصوص لوہے کے کاتب ایسی غلطیاں بالعموم کر جاتے ہیں، البتہ یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کو پرچہ دوبارہ چھپوانے اور پروف پڑھنے کی پھر سے زحمت اٹھانی پڑی۔

آپ کی طرف سے کسی قسم کی اطلاع نہ آنے پر میں خود بھی فکرمند تھا۔ اب آپ کے نوازش نامے سے تاخیر کی وجہ معلوم ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو اور آپ کی اہلیہ محترمہ کو بیماری کے بعد صحت کی نعمت دوبارہ ملی اور ایک بڑے اپریشن کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا، مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ محترمہ موصوفہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ اب چکنائی سے مکمل پرہیز کی ضرورت ہے، میری اہلیہ بھی دو سال پہلے پتے کا اپریشن کرا چکی ہیں، اس لحاظ سے ہم دونوں ہم ذوق ہونے کے علاوہ 'ہم درد' بھی ٹھہرے۔

دوبارہ کنٹریکٹ کی اطلاع سے مجھے دلی مسرت ہوئی ہے، اس مصروفیت کو حتی الوسع برقرار رکھنا چاہیے۔ یعنی:

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آپ کی محبت اور عنایت کا ایک بار پھر شکریہ۔

اللہ کریم آپ کو مع اہل وعیال اپنی امان میں رکھے۔اندرونِ خانہ دعاوسلام پہنچا دیں،والسلام

خیر طلب

ضیا محمد ضیاء

باسمہ تعالیٰ

پسرور

۱۴/۶/۲۰۰۰ء

محبِّ گرامی قدر رانا صاحب،السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نوازش نامہ کافی پہلے ملا تھا، رسید میں تاخیر کی وجہ میری مسلسل ناسازیِ طبع ہے پھر اس دوران میں اپنے بزرگوار دوست جناب طاہر شادانی کی دائمی مفارقت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔طبیعت کافی نڈھال ہے۔آج ہمت کر کے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔آپ کی محبتوں کے لیے شکرگزار ہوں اور قدر افزائی کے لیے آپ کی اہلیہ محترمہ کا بھی۔

آپ کی بیماریِ دل کی خبر سے میں دل گرفتہ ہوا اور دل کی گہرائیوں سے آپ کی صحت وسلامتی کے لیے دعائیں نکلیں۔براہ کرم تھکن سے بچئے اور زیادہ سے زیادہ آرام لینے کی کوشش فرمایے۔آپ کا وجود میرے لیے بہت گراں مایہ ہے۔اس مطلب پرست زمانے میں آپ جیسے اخلاص مند اور قدر شناس لوگ کہاں ملتے ہیں،اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، فی الحال زیادہ لکھنے سے معذور ہوں کیوں کہ نقاہت کی وجہ سے ہاتھ کانپنے لگا ہے۔

اندرون خانہ دریچہ بدریچہ دعا وسلام پہنچا دیں۔والسلام

آپ کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو

ضیا محمد ضیاء

لفافہ بند کرنے والا تھا کہ آپ کا تعزیتی خط محررہ ۱۰ر جون موصول ہوا،خط کیا ہے میرے مرحوم برادر طاہر شادانی کا نثری مرثیہ اور دلگداز نوحہ ہے۔اسے پڑھ کر میرے دل کا بوجھ بھی کسی قدر کم ہوا ہے۔میں بوجہ علالت جنازے میں شریک نہیں ہو سکا تھا البتہ اگلے روز اجتماعی دعا کے موقع پر پہنچ گیا تھا۔اہلیہ بھی ہمراہ تھیں کیوں کہ تعلقات گھریلو سطح پر استوار تھے،افسوس کہ کہانی ختم ہو گئی۔اب بھری محفل میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں،زیادہ کیا لکھوں:

زین بیش حکایت نتواں کرد نظیریؔ
افروخت ورق در کف و آتش زباں خاست

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

پسرور

۳رنومبر ۲۰۰۱ء

محبّ گرامی قدر رانا صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مع وابستگاں بخیر وعافیت ہوں گے، اگر چہ عرصہ دراز سے آپ کے ساتھ رابطہ نہیں ہو سکا لیکن میں آپ کے خیال سے ہرگز غافل نہیں رہا۔ خط کتابت کے بغیر بھی دلوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کسی پرانے شاعر کے بقول:

ما اگر مکتوب ننوشتیم عیب مامکن

درمیان راز مشتاقان قلم نامحرم است

''موج زمزم'' (طبع ثانی) اور ''یادِ رفتگاں'' (نو تصنیف) کی ایک ایک کاپی آپ کی فن شناسی اور خوے لطف نوازی کی نذر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

رسید سے مطلع فرمائیں، عزیزان کو دعوات صالحہ، والسلام

نیاز کیش

ضیا محمد ضیاء

باسمہ تعالیٰ

پسرور

۲۳رنومبر ۲۰۰۱ء

برادر عزیز و مکرم رانا صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا، آپ کی طرف سے کتابوں کی رسید نہ آنے پر میں بہت پریشان تھا کہ الٰہی خیر باشد اب آپ کے مفصل خط سے وجہ تاخیر معلوم ہوئی اور آپ کی خیریت کی اطلاع پا کر دل کو اطمینان حاصل ہوا۔

ایک طرف شہید بیٹے کے والدین ہونے کا لافانی اعزاز اور دوسری طرف لخت جگر کی دائمی جدائی کا داغ دلگداز، یادگاری ہال کی افتتاحی تقریب کے موقع پر آپ اور آپ کے اہل خانہ جس ذہنی کیفیت سے گزرے ہوں گے ایک صاحب اولاد اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و استقامت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ ہمیشہ اپنی امان میں رکھے اور آیندہ آپ کو اور آپ کے خاندان کو ہر قسم کی ابتلا و آزمایش سے محفوظ رکھے۔

آپ جب میرے ناچیز کلام کی تحسین فرماتے ہیں تو مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے کیوں کہ آپ کی تحسین صحیح معنوں میں تحسین سخن شناس کا درجہ رکھتی ہے، قدر افزائی کے لیے تہِ دل سے ممنون ہوں۔

کچھ عرصہ پہلے پسرور کے تمام فون نمبروں میں دس نمبروں کی کمی کر دی گئی تھی چناں چہ اب ہمارا فون نمبر 2954 کے بجائے 04342/1954 ہے۔نوٹ فرمالیں۔

فاخر ہریانوی کی مطلوبہ نظم ''ظفر وال'' ارسال خدمت ہے۔''موج صبا'' اب نایاب ہی ہو چکی ہے۔البتہ ترمیم شدہ نسخہ میرے پاس محفوظ ہے۔دوسرے ایڈیشن کے پیش نظر اس نظم کا عنوان مصلحتاً تبدیل کر دیا گیا تھا۔کچھ دیگر ترامیم بھی کی گئیں مگر اشاعت ثانی کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔

میں آپ کی اور آپ کے جملہ وابستگان کی سلامتی اور خیر و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔گھر میں درجہ بدرجہ دعا وسلام پہنچا دیں۔والسلام

خیر طلب

ضیاءالہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پسرور

۱۳/۴/۲۰۰۷ء

محترم و مکرم ڈاکٹر رانا محمد سرور صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔مزاج گرامی

جناب ضیاءالہاشمی صاحب کے مجموعہ کلام ''متاعِ سخن'' کی وصولی کا خط آپ کی طرف سے موصول ہوا۔وہ آپ کے ممنون و شکر گزار ہیں۔

گرامی قدر ضیا صاحب آج کل صاحبِ فراش ہیں۔کچھ کمزوری کی وجہ سے لکھنے سے معذور ہیں۔ان کا حکم تھا کہ بندہ ناچیز آپ کے خط کا جواب لکھے۔لہٰذا تعمیلِ حکم کے تحت وصولی مکتوب جناب کی تحریری رسید ارسال خدمت ہے۔

دعا کیجیے گا جناب ضیا صاحب کی صحت کے لیے۔

والسلام

قاضی عطاءاللہ

ان کا فون نمبر تازہ ترین 052-6441954

اردو کارپس کی بنیاد پر تیار کردہ پہلا اردو-انگریزی لغت

(اِشاعتِ اوّل کا اِبتدائیہ)

ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان

سید محمد ذوالکفل بخاری

پاک و ہند کا علاقہ اردو کی جنم بھومی بھی ہے اور اِس کی نشو و نما کا میدان بھی۔ اردو زیادہ تر بول چال کی زبان ہے۔ اردو ادب کی زبان ہے۔ اردو بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں؛ بولنے سمجھنے والے زیادہ ہیں اور لکھنے والے نسبتًا کم۔ اردو بولنے والے تعداد میں پوری دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں اور جنوبی ایشیا کی تو یہ سب سے بڑی زبان ہے۔ اردو بولنے والوں کا بہت کم حصہ ایسا ہے کہ اردو جس کی مادری زبان ہے۔ اردو ایک سے زیادہ رسوم الخط میں با قاعدہ لکھی جا رہی ہے جو اِس کے رنگی، نسلی، مذہبی اور علاقائی لگاؤں سے بالاتر ہونے کی دلیل بھی ہے اور اِسی لمحے اِس کے اِستعمال کرنے والوں کی ضروریات کے تنوع کی شہادت بھی۔ زبان کا کئی ایک رسوم الخط میں لکھا جانا اُس کے مقبول اور مستعمل ہونے ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پاک و ہند سے باہر تو اخبار اور کتابیں بھی رومن اردو میں چھپنے لگی ہیں، تا ہم اردو کا اپنا روایتی رسم الخط عربی اور فارسی جیسے قدیم رسوم الخط کی توسیع اور اُن سے مشابہ ہے جو سائبر دور کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مشین ریڈایبل کیا جا چکا ہے۔ جس طرح ہر زبان کے حروفِ تہجی حسبِ ضرورت بہت سے روپوں یا پہناووں (فانٹ) میں پیش کیے جا سکتے ہیں، اُسی طرح اردو لکھائی کے لیے بھی کئی ایک فانٹ موجود ہیں، جن میں نستعلیق اپنی دھج اور نسخ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے زیادہ مقبول ہیں۔ اردو کے بارے میں اِن چند باتوں کو مسلمات کا درجہ حاصل ہے۔

انگریزی اِس وقت دنیا کی سب سے کارگزار، لہٰذا کارگر زبان ہے۔ کچھ صدیاں پہلے سے لے کر صدیوں پیچھے تک اِس حیثیت و مرتبے کا لطف عربی بھی لے چکی ہے اور اُس سے بھی پہلے لاطینی و یونانی۔ آج پوری دنیا میں انگریزی کی ضرورت نہ صرف معاشیاتی اور سیاسی ہے بلکہ ثقافتی بھی ہے اور علمی و فنی تو ہے ہی۔ چناں چہ دنیا بھر کی زندہ زبانیں (اور اُن کے رسوم الخط بھی) اِس وقت انگریزی سے بلا واسطہ رابطے میں، اور نتیجتًا اِس کے شدید اثر میں ہیں۔ زبانوں میں الفاظ کا باہم لین دین ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ اِس وقت ہر زبان میں انگریزی کے الفاظ کا لین، دین کی نسبت کہیں زیادہ ہے جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ زبانِ اردو کو بھی انگریزی سے الفاظ لینے کی ضرورت سے انکار نہیں۔ اردو کو زندہ رہنے کے لیے انگریزی کے الفاظ و تراکیب چاہیے ہیں، اور اردو والوں کو آج کے تیز رفتار زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے انگریزی میں مہارت درکار ہے۔ یہیں سے اردو-انگریزی مکالمے کی ضرورت شروع

ہوتی ہے، جسے پورا کرنے کا ایک اہم وسیلہ اردو-انگریزی دو زبانی لغات ہیں۔

اردو-انگریزی کے روایتی/ کلاسیکل لغات جان شیکسپیئر (John Shakespear) (۱۸۱۷ء)، ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) (۱۸۴۸ء)، ایس ڈبلیو فیلن (S W Fallon) (۱۸۷۱ء) اور جان ٹی پلیٹس (John T Platts) (۱۸۸۴ء) کے لغات ہیں جن کی اہمیت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اِن لغات کا امتیاز یہ ہے کہ یہ فیلڈ ورک کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئے اور بعد میں شائع ہونے والے تمام ڈیسک ورک لغات کی بنیاد بنے۔ اِن سب لغات میں پلیٹس کا لغت زمانی اعتبار سے جدید تر ہونے کی وجہ سے علمی، تکنیکی اور الفاظ کے سماو کے پیمانے پر سب سے اچھا ہے۔ پچھلی صدی میں جو نمایاں اردو-انگریزی لغات سامنے آئے؛ اُن میں انجمنِ ترقی اردو پاکستان (کراچی) اور اِدارۂ فیروز سنز (لاہور) کے لغات کے ساتھ ساتھ اِدارۂ کتابستان (لاہور)، اِدارۂ پاپولر (لاہور) اور اِدارۂ سٹینڈرڈ (لاہور) کے شائع کیے گئے لغات کے نام زیادہ سہولت سے لیے جا سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں تازہ ترین لغت تین جلدوں اور تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل "لغاتِ مجتہدی" ہے جو اوائل ۲۰۰۷ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ انجمن کا لغت تو اب زمانے کی گرد میں گم ہو چکا ہے اور ایسا تبرک ہوا ہے کہ آنکھوں سے لگانے کو بھی نہیں ملتا۔ فیروز سنز کا لغت البتہ بے شمار چھپتا ہے اور بے حساب بکتا ہے۔ ذکر کیے گئے بقیہ لغات بھی دستیاب ہیں۔

تھوڑے بہت الفاظ داخل کر لینا تو ہر نئے لغت میں ہو ہی جاتا ہے۔ الفاظ کا یہ شمول، ظاہری بات ہے کہ لغت نویس یا لغت شائع کرنے والے اِدارے کی ترجیحات کے تابع ہوتا ہے۔ کسی مضبوط علمی یا عملی بنیاد پر لغت ترتیب دیا جانا، یا اِس کام کا کسی عوامی/ طبقاتی ضرورت کے پیشِ نظر کیا جانا، دورِ حاضر میں اردو کی حد تک کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اردو کے لغات میں ضروری تقسیم بھی نہیں ملتی۔ یہی معلوم نہیں ہو پاتا کہ کون سا لغت کن لوگوں کے لیے ہے۔ گزری صدی کے اِبتدائی لغات دیکھیں تو ایک ہی لغت میں طول طویل قاموسی اِندراجات، جغرافیائی وسوانحی شذرات، بادشاہوں کے جلوس نامے، تعزیت نامے اور مرثیے، سہرے، تاریخیں، نسلیات کے مطالعے، شعری نکات، ادبی معلومات، جنتری، باہی مقویات کے نسخے، سرمے اور اچار بنانے کی ترکیبیں، دفعِ سحر و تسخیریاتِ محبوب کے مجربات، کنجڑوں بساطیوں کی ہانک پکار، جانوروں کی بولیاں، غرض ہر بھانت کی سوغات ملتی ہے۔ گویا لغت نہ ہوا، بھان متی کا پٹارا ہو گیا، مزید یہ کہ اردو کا شاید ہی کوئی لغت ہو جو لغت نویس کے ذوقی، علمی، سماجی اور بسا حالات علاقائی تعصبات و میلانات کی جولان گاہ نہ ہو۔ اردو میں خالص سائنسی اصولوں پر لغت نویسی ابھی تک، بوجوہ، نہیں ہو پائی اور جہاں تک اردو-انگریزی لغات کی بات ہے، دورِ جدید کی علمی، عملی یا عوامی ضروریات کا نمایندہ کوئی لغت کم سے کم ہماری نگاہ سے نہیں گزرا۔ "لغاتِ مجتہدی" اگرچہ ایک نیا اور اہم اردو-انگریزی لغت ہے لیکن اپنی ضخامت اور پاکستان میں ناموجود ہونے اور عام آدمی اور خصوصاً طلبہ کی پہنچ سے بالکل دور ہونے کی وجہ سے اِس کا یہاں ذکر نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ طلبہ کی عمر یا کسی سطحی تعلیمی اِستعداد کے مناسب سائنسی بنیاد پر تیار کیا گیا کوئی جدید اردو-انگریزی لغت موجود ہی نہیں ہے، چناں چہ یہ بات روشنی میں آ گئی ہے کہ نفاذِ اردو کی مہما گانے والے ہم لوگ محض باتونی واقع ہوئے ہیں یا کامی۔

آج دنیا بھر میں شائع ہونے والے لغات دورِ حاضر کی معاشی، سیاسی، ثقافتی اور لسانی ضروریات کو سائنسی انداز میں پورا کرنے کے لیے لسانی تحقیقات کی بنیاد پر تیار کیے جا رہے ہیں۔ لسانی تحقیقات کے لیے جمع کیا گیا ڈیٹا اگر مقدار میں کثیر، جنس کے اعتبار سے مختلف النوع اور مشین ریڈایبل حالت میں مہیا ہو تو لسانی انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی تکنیکی زبان میں اِسے کارپس

(Corpus) کہتے ہیں ۔اوکسفرڈ، کیمبرج، لانگ مین، کالنس، ریڈرز ڈائجسٹ، میک گرا ہل، پینگوئن، کیسل وغیرہ جیسے لغات شائع کرنے والے بین الاقوامی اِدارے اب اپنے لغات کارپس ہی کی بنیاد پر تیار کر رہے ہیں۔

''کرنٹ اردو–انگریزی لغت'' بھی، کسی حد تک، کارپس کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے جس میں اردو میں زیادہ اِستعمال ہونے والے الفاظ (High Frequency Words) کو خصوصیت سے جگہ دی گئی ہے۔اِن الفاظ کی فہرست تقریباً ڈیڑھ کروڑ الفاظ پر مشتمل اردو کارپس ڈیٹا کی چھٹائی سے بنائی گئی ہے۔یہ ڈیٹا اخباری خبروں، اِداریوں اور اِدارتی صفحوں، مقبول صحافتی و ادبی کالموں، مختلف علاقوں اور ثقافتوں کے نمایندہ اردو بولنے والے باصلاحیت لوگوں سے کی گئی گفتگوؤں، اِنٹرویوؤں، تحقیقی جرائد میں شائع ہونے والے مقالوں، علمی اور ہلکے پھلکے مضامین، مختلف اداروں کے خبرناموں، ادبی وثقافتی رسالوں، پاک وہند سے باہر کی دنیا میں چھپنے والے رسالوں، ڈائجسٹوں، تعارفی/تشہیری بروشروں، اِشتہاروں، سائن بورڈوں، ویب صفحوں اور بلاگز، ریڈیو اور ٹی وی کے نیوز چینلوں، منتخب ٹی وی ڈراموں اور سیریلز، منتخب فلموں، نمایندہ مذہبی و اصلاحی لٹریچر اور دنیا بھر میں کثرت سے پڑھی جانے والی اردو کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو میں کام چلاؤ سمجھ بوجھ رکھنے والے کثیر مجمعوں میں کی گئی اِصلاحی تقریروں کو نقل کر کے ہدست کیا گیا ہے۔ زیادہ اِستعمال ہونے والے ۵۰ ہزار اردو الفاظ کی ایک فہرست ہمیں اِدارۂ تحقیقاتِ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف کمپیوٹر اینڈ ایمرجنگ سائنسز لاہور (www.crulp.org) کے ڈاکٹر سرمد حسین اور محترمہ مدیحہ اعجاز کی عنایت سے مہیا ہوئی، جس کا تطابق (Concordance) ہم نے اپنے ڈیٹا کی بنیاد پر تیار کردہ ۵۰ ہزار الفاظ کی فہرست میں سے ایک نئی فہرست بنائی ہے۔ ہماری فہرستِ الفاظ اِدارۂ تحقیقاتِ اردو کی فہرست کی نسبت کچھ زیادہ جگہوں سے لیے گئے کارپس ڈیٹا کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ اِس فہرستِ الفاظ کے ساتھ ساتھ اِس لغت کے لیے لغوی اِندراجات (Headwords) زیادہ تر اردو–انگریزی کے متذکرۂ بالا کلاسیکل لغات (علی الخصوص پلیٹس کے لغت) اور شمس الرحمٰن فاروقی کی ''لغاتِ روزمرہ'' سے لیے گئے ہیں۔

عملی اردو زبان (Functional Urdu) کا یہ اردو–انگریزی لغت بنیادی طور پر وسطی اور ثانوی جماعتوں کے طلبہ (یعنی جن بچوں کی عمر دس سال اور اِس سے زیادہ ہو) کی سکول، کالج اور روزمرہ ضروریات پورا کرنے کے لیے مرتّب کیا گیا ہے۔اِندراجات کا ڈھانچا (Format) پاکستان بھر میں مختلف تعلیمی نظاموں میں زیرِ تعلیم اعلیٰ، ثانوی اور وسطی تعلیمی درجوں کے طلبہ وطالبات کے کچھ گروپوں میں تجرباتی سوال نامے بانٹ کر اور اُن کے ردِّعمل میں ملنے والی تجاویز یعنی فیڈ بیک کی روشنی میں بنایا گیا ہے۔

''کرنٹ اردو–انگریزی لغت'' میں لغوی اِندراجات کی ترتیب، تشریح اور اندراجات کی خصوصیات کے بارے میں چند باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ا۔ لغوی اِندراجات (Headwords) اردو ترتیبِ تہجی میں، اردو کے روایتی رسم الخط (Indo-Perso-Arabic Script) میں اور خطِ نستعلیق میں ہیں۔لکھی جانے والی ہر زبان کی طرح اردو میں علاماتِ ہجا یعنی حروف (Letters) تو ہیں ہی، اردو کی مخصوص ہکار آوازوں (Aspirated sounds) کے لیے بھی علامات بنائی گئی ہیں جن کے لیے ہائے دوچشمی کو مخصوص کیا گیا ہے۔چناں چہ ہکاریت والی علامات (بھ، پھ، تھ وغیرہ) کے حامل الفاظ ترتیبِ تہجی میں اپنے اپنے موقع پر درج کیے گئے ہیں۔یہ بات واضح رہے کہ درست اِصطلاحی معنوں میں یہ علامات اردو کے حروفِ تہجی نہیں ہیں بلکہ صرف ہائیہ

آوازوں کی نمایندہ ہیں۔دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسی آوازیں موجود ہیں جن کی شناخت کے لیے ایک حرفِ تہجی کافی نہیں ہوتا بلکہ کچھ حرف ہائے تہجی کے میل ملاپ سے ایسی آوازوں کی شناخت کروائی جاتی ہے۔اگر ہر زبان میں موجود ہر آواز کی شناخت کے لیے نیا حرفِ تہجی بنانا شروع کر دیا جائے تو سبھی زبانیں بولنے لکھنے والے ناخواندہ ہو کر رہ جائیں گے، کیوں کہ شناختِ لغت ممکن نہیں رہے گی۔ہر زبان میں ایسی آوازیں ہوتی ہیں جو صوتی شخصیت رکھتی ہیں لیکن لفظ کے شروع میں نہیں آتیں؛ اور اگر آتی ہیں تو اُس آواز کے ساتھ نہیں جو بحیثیتِ حرفِ تہجی اُن کی آواز ہے۔حروفِ تہجی کی تعیین اور تنظیم صوتیات یا علمِ تحریر کی بنیاد پر نہیں بلکہ رواج، روایت اور تاریخ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔کوئی بھی زندہ زبان اپنے حروفِ تہجی کی فہرست میں اضافے یا رائج ترتیب میں تبدیلی کو روا نہیں کرتی۔جس آمدہ آواز کے لیے تحریری سراپے کی ضرورت ہو، موجود علامات ہی میں سے کسی کو اُس کے لیے مختص کر لیا جاتا ہے۔اِس دعوے کی مثال میں عربی اور انگریزی کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ اِن کے حروفِ تہجی سے ہم سبھی مانوس ہیں۔چناں چہ اِس بات کا خاطر نشان رہنا ضروری ہے کہ ہر بڑی زبان کی طرح اردو حروفِ تہجی کا سیٹ بھی جامد (Static) ہے نہ کہ متحرک (Dynamic) اور یہ کہ اردو کے حروفِ تہجی ۳۸ ہی ہیں: ا/ ب پ ت ٹ ث/ ج چ ح خ/ د ڈ ذ/ ر ڑ ز ژ/ س ش ص ض/ ط ظ ع غ/ ف ق ک گ/ ل م ن و/ ہ ھ ء ی ے۔

لیکن دنیا کی اور زبانوں کی طرح اردو میں بھی اِن سب حروفِ تہجی سے الفاظ شروع نہیں ہوتے، جس طرح انگریزی میں حرفِ X سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا یا مثلاً عربی میں ء اگر کسی لفظ کے شروع میں آئے تو اِس کی نشست الف کی کرسی ہوتی ہے۔ اردو میں حرفِ ڑ سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا؛ الف اور ء سے شروع ہونے والے سب الفاظ صورتاً حرفِ الف سے شروع ہوتے ہیں؛ حرفِ ے سے بھی کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا بلکہ یہ علامت ی کی اِمالی آواز کی نمایندہ ہے؛ اور اِسی طرح ہائے مخلوط یعنی ھ بھی کسی لفظ کے شروع میں نہیں آتی بلکہ یہ کسی موجود آواز میں در آنے والے ہکاری عنصر کی نمایندہ ہوتی ہے۔

۲۔ ترتیبِ تہجی میں اردو لغت بورڈ کراچی کی ''اردو لغت (تاریخی اصول پر)'' کی پیروی کی گئی ہے، اِس ذرا سے گریز کے ساتھ کہ ہائیہ آوازوں کو الگ حروفِ تہجی کے طور سے درج نہیں کیا گیا۔

۳۔لغوی اندراجات پر ہر جگہ اِعراب غیر ضروری خیال کیے گئے ہیں کیوں کہ تلفظ (رجوع کیجیے نمبر شمار-۷) رومن حروف میں درج کیا گیا ہے۔

۴۔کسی لفظ کو ٹٹولنا یا اُس کا کھرا ناپنا کہ وہ کس زبان سے، یا کس کس زبان سے ہوتا ہوا، اردو میں آیا ہے، اِس عملی اردو لغت کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔

۵۔اِملا (Orthograph) کے بارے میں یہ اصول اپنایا گیا ہے کہ اِملا کی آئینیت کے ساتھ ساتھ اردو لکھنے والوں کی رائے کا بھی احترام کیا جائے۔اردو لکھائی کا ایک قانون ہے لفظوں کو الگ الگ لکھنا۔اردو لکھنے والوں کے لیے آئیناً اِس قانون کا احترام ضروری ہے۔ہم نے بھی ایسا کیا ہے، لیکن قانون اور عوام دونوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، چناں چہ ہم علمیت یعنی اِملا کی آئینیت اور رواجِ عام دونوں کو یوں ساتھ لے کر چلے ہیں کہ کسی لفظ کا جو اِملا عام چلن میں ہے اُسے اِس قانون کے تحت لا کر خواہ مخواہ شکل سے بے شکل نہیں کیا گیا۔مثال لیجیے کہ ہم نے انجان (بجائے ان جان)، بلکہ (بجائے بل کہ)، بہبود (بجائے بہ بود)، بہترین (بجائے بہ ترین)، بہرحال (بجائے بہ ہر حال)، بہرطور (بجائے بہ ہر طور)، بطور (بجائے بہ طور)، بشرطیکہ

(بجائے بہ شرطے کہ/ بہ شرطیکہ)، بخیریت (بجائے بہ خیریت)، تابدار (بجائے تاب دار)، خوشبو (بجائے خوش بو)، دستکار (بجائے دست کار)، دلبند (بجائے دل بند)، دلکش (بجائے دل کش)، کاریگر (بجائے کاری گر)، کمزور (بجائے کم زور)، کہہ (بجائے کہ -مصدر کہنا کا صیغۂ امر)، کوہسار (بجائے کوہ سار)، گفتگو (بجائے گفت گو)، گمراہ (بجائے گم راہ)، ہمدرد (بجائے ہم درد)، ہمسایہ (بجائے ہم سایہ)، یکبارگی (بجائے یک بارگی)، یکسانی (بجائے یک سانی)، یکسر (بجائے یک سر)، یکسو (بجائے یک سو)، اور انگریزی کے الفاظ میں ایجوکیشن (بجائے ایجو کے شن/ اے جو کے شن)، سیمینار (بجائے سے مے نار/ سیمے نار/ سے می نار/ سیمی نار)، اوریجنل (بجائے اوری اینجل) وغیرہ اِملا استعمال کیا ہے۔ اردو کے باصلاحیت لکھنے والوں میں زیادہ چلن دار ہونے کے اِسی اصول پر اعلیٰ، اونیٰ، تقویٰ، دعویٰ، زکوۃ، علیحدہ، مہندی، تمغہ، طوطا، طمانچہ، عطائی، ٹھیکہ، راجہ، قانونگو، زمیندار، غمگین، گفتگو، وغیرہ الفاظ کی یہی درج کردہ صورتیں روا کی گئی ہیں۔

اِملا کی صریح غلطیوں سے البتہ صرفِ نظر نہیں کیا گیا مثلاً عربی سے آنے والے کچھ الفاظ میں الفِ زائد آتا ہے جیسے بالکل، بالمقابل، وغیرہ؛ حرفِ الف کے اِس قسم کے تقاعلات والے الفاظ کو الفاتِ زائد کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے، اگرچہ اخبارات میں اور سائن بورڈوں پر بلکہ کتابوں کے سرورق پر تک یہ الفاظ بلا الف بھی دیکھے جا رہے ہیں۔ اِسی طرح پاکستان میں چھپنے والے ایک بڑے اردو اخبار میں اور ایک مقبول ٹیلیوژن نیوز چینل پر لفظِ قاعدہ آج کل بصورتِ فائدہ اور لفظِ قواعد بصورتِ فوائد لکھا جا رہا ہے، جو ظاہری بات ہے کہ نادرست ہے۔ ایک اور متشدد رویہ آج کل ہمزہ کو اردو کے الفاظ سے نکال باہر کرنے کے سلسلے میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اصلاحِ اِملا کے زور میں خالص عربی الفاظ مثلاً قائل، ذرائع، شائع، مائع، مائل، مسائل، فرائض، وقائع، وظائف، وغیرہ میں بھی ہمزہ کی جگہ ی لگائی جانے لگی ہے۔ یہ الفاظ ہمزہ کے بغیر لکھنا یقیناً غلط بلکہ اِن کے ساتھ مذاق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چناں چہ اِملا کی اِس قبیل کی غلطیوں کو صریح غلطی تصور کیا گیا ہے۔ اِملاء کے لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ''اِملاء نامہ'' کے دوسرے ایڈیشن سے بہت رہنمائی لی گئی ہے۔

۶۔ سکونِ اوّل کے حامل دخیل الفاظ (انگریزی، سنسکرت) کو بطورِ لغوی اِندراج الف کے تقاعل کے بغیر لکھا گیا ہے۔ یہ ترتیب اِس لیے اِختیار کی گئی ہے کہ قاری مثلاً لفظِ سکندریہ (شہر) کو سکندر (اسم، عَلَم) کے اِندراج کے بعد ہی ڈھونڈے گا۔ چناں چہ لفظِ سکندریہ کے شروع میں الف کا تقاعل نہیں لگایا گیا۔ البتہ افسانہ، افسوس، اگر، افکار، اطاعت، ابراہیم، اقبال، افروختہ، افروز، افزا، افشانی، افغان، اِسرائیل، وغیرہ الفاظ جو شعری چھوٹ (Poetic License) کی وجہ سے اِبتدائی الف کے بغیر بھی مستعمل ہیں، اپنے پورے اِملا کے ساتھ ہی لکھے گئے ہیں، ویسے بھی اردو اب اِتنا سفر کر چکی ہے کہ سکونِ اوّل قسم کی بحثیں ختم ہو گئی ہیں؛ اردو والے سکونِ اوّل پر قادر ہو گئے ہیں۔

۷۔ لغوی اِندراج کے بعد اُس کا تلفظ ہلالین کے اندر رومن حروف اور ایسکی جدول (ASCII: American Standard Code for Information Interchange) کی کچھ علامات کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ تلفظ لکھنے کے لیے اصولاً عالمی صوتی ابجد (International Phonetic Alphabet) اِستعمال ہوتا ہے لیکن اِس لغت میں تلفظ کے لیے رومن حروف کا اِستعمال اِس لغت کے مجوزہ قاری کی ذہنی/ علمی سطح کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔ رومن حروف میں تلفظ بین الاقوامی اِداروں

کے شائع کردہ کچھ لغات میں بھی ملتا ہے، جیسے چیمبرز کے لغت میں۔ تلفظ ظاہر کرنے کے لیے اِستعمال کیا گیا ضابطہ، مع ضروری شذرات، اِبتداے لغت میں موجود ہے۔ تلفظ کا یہ ضابطہ اِس پیشگی یقین کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ اِس لغت کا قاری اردو کے روایتی رسم الخط سے بخوبی آگاہ ہے۔ تلفظ کو سادہ تر رکھنے کی ایک وجہ اردو کے اِس لفظ نگار (اِن پیج) کی محدودیت بھی ہے جس میں یہ لغت ٹائپ کیا گیا ہے۔

۸۔ لغوی اِندراجات کا وہ تلفظ اختیار کیا گیا ہے جو عام طور سے زبانوں پر ہے اور جس سے ہمارے کان مانوس ہیں؛ اِس ضمن میں کسی لفظ کے اصل (Root) یا درست تلفظ پر ناجائز اِصرار نہیں کیا گیا۔ مثال لیجیے کہ لفظ ملزم اپنی اصل کے اعتبار سے 'زٔ' پر زبر کے ساتھ ہے لیکن چوں کہ ہمارے ہاں یہ 'زٔ' کے نیچے زیر کے ساتھ رائج ہے اِس لیے اِنشاء اللہ خاں اِنشاء کے وضع کردہ اصولِ اُردویت کے مطابق اِس لغت میں اِسے اِسی تلفظ کے ساتھ لکھا اور برتا گیا ہے چناں چہ یہ لغت اِس اصول پر تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو بولنے والے جو کچھ بول رہے ہیں اور جیسے بول رہے ہیں، وہی اردو ہے۔ یہ اصول اردو کی لسانی آزادی اور خودمختاری کا منشورِ عظیم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِنشاء نے ''دریاے لطافت'' میں جگہ جگہ اپنے اِس اصولِ اُردویت کا اِرتداد خود بھی کیا ہے۔ لغت نویس کو لوگوں کی زبان پکڑنے کا نہ تو اختیار ہے اور نہ کسی لفظ/تلفظ وغیرہ کے بارے میں قولِ فیصل بجو دینا اُس کا منصب۔ اردو کے عظیم لغوی جناب شان الحق حقی کے نزدیک یہ لغت نویسی کا ایک بنیادی اصول ہے — اور اِس لغت میں اِس اصول کی پیروی کی گئی ہے۔

ہاں! تلفظ کی صریح غلطیوں پر البتہ سمجھوتا نہیں کیا گیا مثلاً عربی مادّے و ج ہ سے مشتق لفظ توجہ دیکھیے۔ یہ بروزنِ تصنع ہے:شد ج بضم اِس سے اسمِ صفت متوجہ بنتا ہے:شد ج بکسر لیکن آج کل اِسے بروزنِ تصنع بولتے سنا جا رہا ہے:شد ج بضم۔ اِس وزن کے بہت سے الفاظ اردو میں عام ہیں مثلاً متنبہ، متنوع، متوقع، وغیرہ۔ عام اردو استعمال میں اِن الفاظ میں آخری سے پہلے حرف کے نیچے زیر آتی ہے اِس لیے لفظِ متوجہ سمیت اِن سب لفظوں کو آخری سے پہلے حرف پر پیش کے ساتھ بولنا یقیناً کھلی ہوئی غلطی ہے چناں چہ تلفظ کی ایسی غلطیوں کو صریح غلطی تصور کیا گیا ہے۔

۹۔ تلفظ کے بعد کج رومن حروف میں اجزاے کلام (Parts of Speech) میں سے لغوی اِندراج کی قسم لکھی گئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِندراج اسم، فعل، صفت، محاورہ، ضرب المثل وغیرہ میں سے کیا ہے۔ تمام موجود لغات کی طرح یہاں بھی اِسے مخفف صورت میں لکھا گیا ہے اور اِن مخففات کی فہرست اِبتداے لغت میں درج کی گئی ہے۔

۱۰۔ اِس لغت میں اردو الفاظ کے انگریزی معنی تعریف کے ذریعے بیان کرنے کے بجاے اصولاً مترادفات کی شکل میں لکھے گئے ہیں، لیکن یہ کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے: ضروری جگہوں پر مختصر الفاظ میں تعریف بھی دے دی گئی ہے۔ کثیر زبانی لغات میں تو خاص طور سے ثقافتی، مذہبی، قومی اور سیاسی وغیرہ اہمیت کے حامل لغوی اِندراجات میں نرا مترادف کچھ کام نہیں دیتا بلکہ تعریف/توضیح ہی چاہیے ہوتی ہے جیسے مہندی، منگنی، منگیتر، شہ بالا، عقیقہ، حج، عمرہ، سعی، آبِ زم زم، وضو، نماز، پاک، ناپاک، محرم، نیاز، تعزیہ، پھول چننا، کالا پانی، غدر، راج، کمپنی، عبورِ دریاے شور، دو قومی نظریہ، نظریۂ پاکستان وغیرہ۔ مرادفات کا محض ڈھیر لگا دینے کے بجاے ترجیحی درجہ بندی بھی ضروری خیال کی گئی ہے، چناں چہ اندراجِ معنی میں ترتیب یہ

رکھی گئی ہے کہ عموماً سب سے پہلے لفظ کے ٹھیٹھ لفظی معنی ہیں؛ اِس کے بعد مجازی، اِصطلاحی، رسمی، ادبی، مرادی، ثقافتی، سلینگی معنی وغیرہ دیے گئے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اردو الفاظ کے انگریزی مترادفات زیادہ تر وہی ہوں گے جو بطورِ اصطلاح مستعمل ہیں مثلاً تارگھر=Telegraph Office۔

مترادفات کے ضمن میں ایک قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ مترادفات کا چناؤ رجسٹر (Register) کی تعیین کے بغیر ممکن نہیں ہوتا؛ چناں چہ ہم نے مترادفات کے لیے پاپولر سائنس اور معلوماتِ عامہ کا رجسٹر خاص طور سے منتخب کیا ہے۔

۱۱۔ تحتی الفاظ یا تابعات (Sub-entries) کو اِس لغت میں ممتاز نہیں کیا گیا۔ متعلق مرکبات، مشتقات، محاورات، ضرب الامثال، فقرات وغیرہ لغوی اِندراج کے بعد کوئی پوٹ چھوڑے بغیر ایک ہی کالم میں، ایک ہی سیدھ میں اور Lexicon کے انداز میں یکجا کر دیے گئے ہیں، چناں چہ مثلاً لغوی اِندراج جرم کے بعد کے اِندراجات یوں ہیں: اِثباتِ جرم، اِرتکابِ جرم، اقبالِ جرم، اِقدامِ جرم، بے جرم، ثبوتِ جرم، جرمِ خفیف، جرمِ شدید، جرمِ عظیم، جرم سے منکر ہونا، قابلِ دست اندازی جرم، قابلِ ضمانت جرم، نا قابلِ ضمانت جرم، جرم کا مرتکب ہونا، جرمِ واجب القتل۔ یہ ترتیب بھی اِس لغت کے مجوزہ قاری کی تعلیمی استعداد کی مناسبت سے اختیار کی گئی ہے۔

۱۲۔ گھڑنت (یعنی موضوع) الفاظ و تراکیب کو بطورِ لغوی اِندراج شامل نہیں کیا گیا مثلاً ذُر فعطنی، فل فل فوٹی، یونہیات، واوینیات، لفنگیات، بوریت، میڈی، لتر ول بلتریشن، روڈ ماسٹر (ی) وغیرہ۔ وجہ یہ ہے کہ گھڑنت الفاظ کا دائرۂ کار اور اِستعمال محدود ہوتا ہے اور یہ، زیادہ تر، وقتی اور عموماً متفنن عوامی ایجادات ہوتے ہیں۔ اِصطلاحات سازی میں تو عوامی جینئس کی کرامات اردو والوں کا طرۂ اِمتیاز ہیں مثلاً سامراج، ٹیکہ لگانا (Vaccination)، چاند گاڑی (Space-shuttle)، کھڑکی توڑ ہفتہ، وغیرہ چناں چہ ایسے گھڑنت الفاظ و تراکیب یقیناً شاملِ لغت ہیں جو عام رائج ہیں، مثلاً گلاب (بمعنی پھول)، اشقلہ (چھوڑنا)، صلواتیں سنانا، لمبی چھوڑنا، شو مارنا، پھسوڑی، چھوڑو چھڈو، واردا تیا، ہٹ پونجیا، بھانجے بھتیجے، کھاؤ پیو، وغیرہ؛ اور وہ الفاظ بھی جن کی کوئی لغوی اصل نہیں ہے اور اُن کے معنی صرف بولنے سننے سے طے ہوئے ہیں مثلاً نورا کشتی، کتے خصی کرنا، نائیں نائیں فش، قربانی کا بکرا، مرزا پھویا، چاند چڑھانا، ٹوپی ڈرامہ، چوندا چوندا، ٹھنڈ پروگرام، ٹھنڈ رکھنا، منڈ رکھنا، نیم نام، پوپٹ، لش پش، لشتم پشتم آنا / جانا، رگٹ پٹ، بلزم پلزم، چٹر پٹر۔

گھڑنت الفاظ کے بارے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ لفظ گھڑنت سے یہاں اردو کی بے مثال قوتِ انجذاب یا اِختراع کی نفی نہیں کی جا رہی۔ اصولاً ہر نیا لفظ گھڑنت ہی ہوتا ہے۔ عربی فارسی کا تو کیا ذکر کہ اِن کے بہت ہی کم الفاظ ہیں جو اردو کی خراد پر چڑھ کر ہندیائے جانے سے بچ پائے ہیں، اردو نے ہر اُس زبان سے الفاظ لے کر اپنی ضرورت کے مطابق اُن کی ڈھلائی، ستھرائی اور تراشائی کر لی ہے جس سے اردو کا کبھی بھی واسطہ پڑا ہے: بادشاہت، مسلمان، سمجھدار، علیحدہ (الگ کے معنی میں)، جواہر مالا، رہایش، فرمایش، رکشے والا، ریل گاڑی، واردات، تعیناتی، وغیرہ الفاظ و تراکیب بھی کبھی ضرورتاً گھڑے گئے تھے اور جن میں سے کچھ پر خوب بحثا بحثی جا چکا ہے، آج یہ عام چلن میں ہیں — اور اِسی لیے لغات کا بھی حصہ ہیں۔

۱۳۔ انگریزی کے دخیل الفاظ کو بطورِ لغوی اِندراج بہت ہی کم تعداد میں شامل کیا گیا ہے کیوں کہ یہ لغت ہے ہی اردو سے انگریزی۔ انگریزی لفظ کو اردو رسم الخط میں نقلِ حرفی کر کے لکھنا اور اِسے واپس انگریزی ہجوں میں لکھ دینا ایک طرح سے فاضل

(Redundant) کام ہے۔البتہ ایسے دخیل الفاظ جن کی صوتی شخصیت میں بہت تبدیلی آچکی ہے یا معنًا قلبِ ماہیت ہوچکی ہے اور اُنھیں داخلِ لغت کیے جانے کا جواز بنتا ہے مثلاً اردلی، پلٹنی، بلغم، بوکا، پتلون، پھٹیک، چالان، ذیابیطس، سنتری، کمیٹی (ڈالنا)، کنستر، لالٹین، واسکٹ وغیرہ اُن کو ضرور جائز کیا گیا ہے۔یاد رہے کہ انگریزی الفاظ کا اردو میں آ کر اپنی صوتی شخصیت تبدیل کر لینا اردو میں آوازوں کی خوشتری اور کثرت کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔اور یہ بھی ایک کھلا راز ہے کہ مغربی مصنوعات کے ناموں کو تو الگ رکھیے کہ اِن کے بغیر تو آج کوئی بھی زبان بولنے والا محض چند جملے نہ بول پائے گا، انگریزی کے کئی ایسے ادبی الفاظ بھی اردو کے جسم کا حصہ ہیں جن کا اردو کے پاس سرے سے کوئی متبادل ہی نہیں مثلاً لفظِ پیراگراف۔

۱۴۔ چوں کہ اِس لغت کی بنیادگزاری میں دورِ حاضر کی چلن دار اردو کا کارپس ڈیٹا شامل ہے اِس لیے عام چلتے چلاتے اور بول چال میں رائج اردو الفاظ اور سلینگ الفاظ/معنٰی اِس لغت میں نسبتاً زیادہ ملیں گے مثلاً پرچی چلانا، پھوں پھاں کرنا، چوڑی کسنا، دھو ڈالنا، لیتھو بنانا وغیرہ اور اِسی طرح الفاظ کے سلینگی معنٰی بھی مثلاً لفظِ چمچہ اور چمچی کا ایک معنٰی supporter، اور لفظِ لوٹا کا ایک معنٰی unfaithful politician وغیرہ۔لیکن کارپس ڈیٹا شامل کرنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ آوازوں تو ازوں کو داخلِ لغت کر کے بھانڈیت کو پھیلایا جائے۔چناں چہ مکالموں میں آنے والے سب الفاظ کا صحیح آوازی صورت میں لغوی اِندراج بنا ضروری خیال نہیں کیا گیا، مثلاً بچارا (بے چارا)، وہیں (وہی)، روئیں (روئی)، چانول (چاول)، سونٹا (سوٹا)؛ کیرانچی (کراچی)، گائیں (گائے)، گھانس (گھاس)، مونکا (موقع)، نفہ (نفع)؛ اِسی طرح خالص مصوتوں میں در آنے والی واضح یائیت کو بھی روا نہیں کیا گیا مثلاً موقعے (موقع)، برقعے (برقع)، مصرعے (مصرع)، منافعے (منافع) وغیرہ۔اِسی طرح پوشیدہ اعضاے جسمانی کے نام اور مبتذل الفاظ بھی عموماً نا روا کیے گئے ہیں۔

۱۵۔ لغت یا معنٰی اِختراع کرنا لغت نویس کے دائرۂ کار ہی سے باہر نہیں بلکہ اُس کا حق بھی نہیں ہے؛ اِس اصول کو ہم تسلیم کرتے ہیں، لیکن زبان کے برق رفتاری سے سفر کی وجہ سے جب دخیل الفاظ کی بھرمار ہو جائے تو کچھ الفاظ/اِصطلاحات کے لیے مناسب اردو مترادفات تجویز کر دینا بھی ہم روا جانتے ہیں۔چناں چہ اِس لغت میں جہاں ایسے تازہ ترین اردو الفاظ و مرکبات مل جائیں گے جن کی بطورِ اصطلاح بڑے پیمانے پر استعمال کی عمر ابھی چند ہفتوں سے زیادہ نہیں ہو پائی، مثلاً شدت پسند (extremist) اور عسکریت پسند (militant)، وہیں ایسے دخیل الفاظ و اِصطلاحات کے لیے بنائے گئے اردو مترادفات بھی جا بجا ملیں گے جیسے swine flu کے لیے خنزیری نزلہ اور honour-killing کے لیے قتلِ غیرت/غیرت کے نام پر قتل۔

۱۶۔ سیاسی نوعیت کے نئے الفاظ اور الفاظ کے تازہ سیاسی اِصطلاحی معنٰی بھی کوشش کر کے شامل کیے گئے ہیں۔سیاسی اور مذہبی نوعیت کے مقامات کے نام بطورِ لغوی اِندراج جہاں کہیں شامل کیے گئے ہیں وہاں ضروری معلومات مختصر ترین الفاظ میں دی گئی ہیں تاکہ لغت اور دائرہ معارف کا فرق ملحوظ رہے چناں چہ اِس لغت میں بنیاد پرست، بین المذاہبی مکالمہ، شرم الشیخ وغیرہ جیسے اِندراجات عام طور سے ملیں گے۔

۱۷۔ اردو کے مزاج اور ثقافت سے لگّا کھاتے نئے الفاظ کو بھی بطورِ خاص تلاش کر کے لغوی اِندراج بنایا گیا ہے، اور اِس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اِس تلاش میں اِنٹرنیٹ سے بہت مدد لی گئی ہے۔مثال لیجیے کہ یورپ کی باعمل مسلمان عورتوں نے

برقعے اور bikini کے امتزاج سے تین کپڑوں پر مشتمل ایک باپردہ لباس برقنی کے نام سے متعارف کرایا ہے جو بے حد مقبول ہوا، چناں چہ ایسے نئے لفظ اِس لغت میں شامل ہیں۔

۱۸۔ عملی زبان کے لغت میں اگر جانوروں کی آوازیں اور اِس قبیل کی چیزیں شامل کی جائیں تو اردو کے ایک محاورے کے لفظی اِستعمال کی زبان میں ایسے لغت کو چوں چوں کا مربہ کہا جا سکتا ہے۔لہٰذا غیر انسانی اور بے معنی آوازوں (لسانیات کی اِصطلاح میں لغویہ:Lexeme) کو بھی عموماً بطورِ لغوی اِندراج شامل نہیں کیا گیا۔بامعنی، خصوصاً فجائیہ اور ہنکاریہ مفہوم والی آوازوں کو، الفاظ کا درجہ دے کر، البتہ، شاملِ لغت کیا گیا ہے۔

۱۹۔ اوپر کے سات نمبرات میں پیش کی گئی معروضات کی روشنی میں اِس لغت کے لیے "لفظ" یعنی Lexical Item کی تعریف بھی واضح طور پر متعین ہو جاتی ہے۔

○

آخر میں ایک گزارش، عرض ہے کہ یہ دو زبانی اردو-انگریزی لغت علمیت، کاملیت یا اوّلیت کے کسی دعوے کے ساتھ نہیں بلکہ انتہائی انکسار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔بساط بھر کوشش کے باوجود علمی اور پروف دونوں طرح کی اغلاط اور صرفِ نظر کا پایا جانا ناممکن نہیں۔اہلِ فن، اہلِ علم اور معلمین کرام تو اِس پہلے ایڈیشن کو تسویدی ایڈیشن ہی خیال فرمائیں۔آیندہ ایڈیشن کے لیے یہ حضرات جو بھی سنجیدہ تجاویز پیش کریں گے، اُنھیں اِن شاءاللہ حکم کے طور پر قبول کیا جائے گا۔

لغت کی تیاری میں ہمہ وقت مدد دینے پر مرتبین خواجہ محمد زکریا صاحب اور خورشید رضوی صاحب کے ممنون ہیں۔

وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ.

وَتَرَکۡنَا عَلَیۡهِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ.

☆☆☆

چودھری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز، اردو بازار لاہور کے شائع کردہ اس لغت کا ابتدائیہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اور پسِ ورق ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی نے تحریر کیا ہے۔فلیپ پر شان الحق حقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی آراء درج ہیں۔لغت کا انتساب شان الحق حقی، عابد صدیق، ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان اور محمد سہیل عمر کے نام کیا گیا ہے۔

نقوشِ نظر

پروفیسر محمد انصار اللہ کے نثری کاموں کی سرسری فہرست

محمد انصار اللہ

کتابیں:

۱۔	اردو کے حروفِ تہجی	۱۹۷۲ء	لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ
۲۔	غالب ببلیوگرافی	۱۹۷۲ء	مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
۳۔	پدماوت کی مختصر فرہنگ o	۱۹۷۲ء	لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ
۴۔	قاعدۂ ہندی ریختہ عرف رسالۂ گل کرسٹ o	۱۹۷۳ء	ایضاً، ایضاً
۵۔	برہمن کی کہانی یا مقصود کا بارہ ماسہ	۱۹۷۴ء	ایضاً، ایضاً
۶۔	تلخیصِ معلّا مولفہ نادر	۱۹۷۵ء	انجمن ترقی اردو، کراچی
۷۔	اردو صرف	۱۹۷۵ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
۸۔	اردو نحو	۱۹۷۵ء	ایضاً، ایضاً
۹۔	قطعۂ منتخب (تذکرۂ ناسخ)	۱۹۷۶ء	انجمن ترقی اردو، کراچی
۱۰۔	تلخیصِ معلّا۔ ترمیم و اضافہ کے ساتھ o	۱۹۷۶ء	لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ
۱۱۔	رسالہ زبان ریختہ مولفہ ناسخ	۱۹۷۷ء	ایضاً
۱۲۔	شعرائے اردو کے اولین تذکرے o	۱۹۷۸ء	ایضاً
۱۳۔	شعر کبیر۔ ترجمہ کبیر پداولی ☆	۱۹۷۹ء	ایضاً
۱۴۔	تاریخ اقلیم ادب۔ پہلا حصہ	۱۹۷۹ء	ایضاً
۱۵۔	ایضاً۔ دوسرا حصہ	۱۹۸۰ء	ایضاً
۱۶۔	انتخابِ زکی	۱۹۸۱ء	ایضاً
۱۷۔	انتخابِ رشک	۱۹۸۱ء	یوپی اردو اکیڈمی، لکھنو

۱۸۔	صہبائی۔ایک مختصر تعارف o	۱۹۸۶ء	لیتھوکلر پرنٹرس،علی گڑھ
۱۹۔	اردو صرف۔طبع جدید	۱۹۸۶ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ
۲۰۔	اردو نحو۔طبع جدید	۱۹۸۶ء	ایضاً
۲۱۔	اصطلاحات جمالیات	۱۹۸۷ء	لیتھوکلر پرنٹرس،علی گڑھ
۲۲۔	اردو پر تمل کے اثرات	۱۹۸۸ء	ایضاً
۲۳۔	معتمدالدولہ۔اسلاف اوراخلاف ☆	۱۹۸۹ء	غالب انسٹی ٹیوٹ،دہلی
۲۴۔	داتا دیال مہرشی شیوبرت لال ورمن	۱۹۹۱ء	ساہتیہ اکیڈیمی،دہلی
۲۵۔	قدیم متون۔حصہ نظم	۱۹۹۱ء	مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ
۲۶۔	سنسکرت اردو لغت	۱۹۹۳ء	مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد
۲۷۔	داتا دیال مہرشی شیوبرت لال ورمن۔حیات وخدمات	۱۹۹۴ء	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ
۲۸۔	داتا دیال مہرشی شیوبرت لال ورمن اوران کی کتابیں	۱۹۹۴ء	ایضاً
۲۹۔	چندراین مصنفہ مولانا داؤد	۱۹۹۶ء	ادارہ تحقیقات اردو،پٹنہ
۳۰	غالب ببلیوگرافی (کتابیں)	۱۹۹۸ء	غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی
۳۱۔	دربار اکبری (مصنف محمد حسین آزاد) مع دیباچہ واشاریہ ازمحمد انصاراللہ	۲۰۰۰ء	قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی
۳۲۔	کتابیات ادب اردونمبر ۱۴۸	۲۰۰۲ء	مغربی پاکستان اردواکیڈیمی،لاہور
۳۳۔	جامع التذکرہ جلداول	۲۰۰۶ء	قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی
۳۴۔	ایضاً (جلددوم)	۲۰۰۶ء	ایضاً
۳۵۔	ایضاً (جلدسوم)	۲۰۰۷ء	ایضاً
۳۶۔	تاریخ ارتقائے زبان وادب	۲۰۰۸ء	مغربی پاکستان اردواکیڈیمی،لاہور
۳۷۔	اردو پر تمل کے اثرات	۲۰۰۸ء	ایضاً،لاہور

انعامات

جن کتابوں پر o نشان بنا ہے،ان پر یوپی اردو اکیڈیمی لکھنو سے انعام ملے۔جن کتابوں پر ☆ نشان بنا ہے،ان پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ سے انعام حاصل ہوئے۔کل ہند میرا کیڈمی،لکھنو کی طرف سے ۱۹۸۵ء میں امتیاز میر اور ۱۹۹۳ء میں نوائے میر عطا ہوا۔

بہ زبان ہندی

۱۔ مہرشی شیوبرت لال کا کلام نیر اعظم (دیوناگری خط میں) ۱۹۹۶ء شیوبرت لال اکیڈیمک ریسرچ سوسائٹی،علی گڑھ

۲۔ نیرِاعظم (متن دیوناگری خط میں مع انگریزی ترجمہ) ۱۹۹۹ء ایضاً

امتحانی مقالات

۱۔ برائے ایم اے (اردو) — غزلیات ذوق، ردیف الف، مع مقدمہ وغیرہ

۲۔ برائے پی ایچ ڈی (اردو) — میر علی اوسط رشک۔ حیات وخدمات

۳۔ ضمیمہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی — نظم آخریں یعنی میر رشک کا تیسرا دیوان مع مقدمہ

اعزازات

۱۔ عشرۂ نہم میں چند سال خدابخش لائبریری پٹنہ کا وزیٹنگ فیلو

۲۔ حافظ محمود خان شیرانی (بین الاقوامی) تقریبات لاہور ۱۹۸۰ء کا رکن

۳۔ رشید احمد صدیقی سنٹری، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۹۵ء کا رکن

----

۳۱ مارچ ۲۰۰۱ء کو حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل کر کے دہلی پہنچے۔ دسمبر ۲۰۰۶ء کو اللہ نے اپنے کرم سے حج اکبری سعادتوں سے نوازا۔ پروردگار قبول کرے۔

داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن

(۱) ترجمہ بہ زبان ہندی — ساہتیہ اکیڈیمی، نئی دہلی ۱۹۹۵ء

(۲) ترجمہ بہ زبان انگریزی — ایضاً

کتابیں جو رسالوں/جریدوں وغیرہ میں شائع ہوئیں:

نمبر شمار	نام کتاب	رسالہ/مجلّہ	ماہ وسال
۱۔	تذکرہ طیب	ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر	جون تا دسمبر ۱۹۶۵ء
۲۔	ایضاً	سہ ماہی اردو، کراچی	نمبر ۱۔ ۱۹۸۴ء
۳۔	احوال الشعرا	رفتار، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۲ء
۴۔	خطوط ایران (ڈاکٹر نذیر احمد کے خطوط)	سہ ماہی اردو، کراچی	نمبر ۲۔ ۱۹۸۴ء
۵۔	جنادیہ تاریخ گوی	سہ ماہی دانش، اسلام آباد	ویژہ نامہ ۱۹۸۷ء
۶۔	مخزن امثال مولفہ اختر	سہ ماہی اردو، کراچی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء
۷۔	کبیر کا "الف نامہ"	ششماہی کتاب شناسی، اسلام آباد	نمبر ۲۔ ۱۹۸۸ء
۸۔	قدیم آریوں میں علم تحریر کا رواج مولفہ داتا دیال	مجلّہ نقوش، لاہور	سالنامہ ۱۹۸۹ء
۹۔	کالی داس۔ پریم چند کی نظر سے	سہ ماہی اقبال، لاہور	اپریل تا جولائی ۱۹۹۲ء
۱۰۔	پدماوت کی فرہنگ	سہ ماہی اردو، کراچی	نمبر ۳، ۴۔ ۱۹۹۴ء

۱۱۔	فرہنگ کبیر مولفہ شیو برت لال ورمن	ماہنامہ ندائے جمہور، علی گڑھ	نمبر ۱ تا ۶
۱۲۔	حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ	ششماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی	جنوری تا جون ۱۹۹۷ء

بزبان فارسی

۱۔	مفتاح السرور عادل شاہی ۔ متن مع ترجمہ	ماہنامہ الحکمت، دہلی	فروری ۱۹۶۷ء تا نومبر ۱۹۶۹ء
۲۔	عوارف ہندی	سہ ماہی دانش، اسلام آباد	نمبر ۱۴۔۱۹۸۸ء

مضامین جو کتابوں میں شامل ہیں:

نمبر شمار	مضمون	نام کتاب مع مرتب / ناشر / مقام	سال طباعت
۱۔	سرسید اور ہومیو پیتھی	سرسید اور ہومیو پیتھی، ڈاکٹر یحییٰ خاں شروانی، علی گڑھ	۱۹۷۰ء
۲۔	حرف یا اور مسئلہ تذکیر و تانیث	نذر مقبول، خیر بہوروی، جونپور	۱۹۷۰ء
۳۔	تقریظ	نوائے سحر (دیوان)، سحر اعظمی، لکھنو	۱۹۷۸ء
۴۔	مقبول صاحب	نقش مقبول، خورشید عالم لاری، الہ آباد	۱۹۸۳ء
۵۔	اردو غزل ۔ سولھویں صدی عیسوی تک	اردو غزل، ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی	۱۹۸۷ء
۶۔	نظیری کی عظمت	نظیر شناسی، اکبر بیگ و محمد علی اثر، حیدرآباد	۱۹۸۸ء
۷۔	بدیع الزماں خاور	سات سمندر کا شاعر، ساحر شیوی، نئی دہلی	۱۹۸۸ء
۸۔	علیم صبا نویدی اور ہائیکو	روشن لکیر، ڈاکٹر اختر بستوی، دہلی	۱۹۹۰ء
۹۔	پروقار انکسار	مقبول احمد لاری، آل انڈیا میر اکیڈیمی لکھنو	۱۹۹۲ء
۱۰۔	ہائیکو	ہائیکو ۔ تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر رفعت اختر، ٹونک	۱۹۹۳ء
۱۱۔	ضرب الامثال	اسلوب اور اسلوبیات، طارق سعید، دہلی	۱۹۹۵ء
		(یہ مضمون مرتب نے میری اطلاع کے بغیر اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے ۔)	
۱۲۔	اردو نثر پر ہندو مذہب کا اثر	اردو رسائل ۱۹۹۴ء میں، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ	۱۹۹۵ء
۱۳۔	آمنہ خاتون کی ''دکنی کی ابتدا''	کلام غالب کے انگریزی ترجمے، محمد خاں، بنگلور	۱۹۷۱ء
۱۴۔	علیم کی جدت پسندی نعت میں	نقش قلم، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	
۱۵۔	کلام شوق کے بارے میں ابتدائی تاثر	سوونیر جشن خواجہ شوق، جشن خواجہ شوق کمیٹی	حیدرآباد
۱۶۔	تاثرات نظر	اعتراف، مبشر علی صدیقی، بدایوں	۱۹۸۵ء
۱۷۔	پیش لفظ	مبشر علی صدیقی شخصیت و فن، پروفیسر اولاد احمد صدیقی، بدایوں	۱۹۸۳ء
۱۸۔	پیش لفظ	بدایوں کے چند ادبا و شعرا، مبشر علی صدیقی، بدایوں	۱۹۷۶ء
۱۹۔	پیش لفظ	از خاک بدایوں، شمس بدایونی، بدایوں	۱۹۸۵ء

۲۰۔	سرور صاحب	ال احمد سرور۔دانش ورنقاداورشاعر، غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی	۱۹۹۷ء
۲۱۔	مقدمہ	نگارطیبہ(نعتیہ کلام محسن رضا جونپوری)،مرتب افتخار احمد،بلند شہر	۱۹۹۷ء
۲۲۔	اردو میں تاریخ گوئی کا رواج	نگارستان تاریخ،کلیم سرونجی،بھوپال	۱۹۹۷ء
۲۳۔	غالب کے تذکرہ نویس	انتخابات مقالات غالب نامہ تحقیقات،پروفیسر نذیر احمد،دہلی	۱۹۹۷
۲۴۔	مقدمہ نعرہ درویش	تحفۂ درویش ونغمہ درویش، پروفیسر محمد غلام حسین دلیل، مدراس	۱۹۹۶ء
۲۵۔	مقدمہ	نعرۂ درویش،پروفیسر محمد غلام حسین دلیل،مدراس	۱۹۹۴ء
۲۶۔	مقدمہ	باغ وبہار،میرامن، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی	
۲۷۔	مقدمہ واشاریہ	دربار اکبری، محمد حسین آزاد، نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان،دہلی	۲۰۰۰ء
۲۸۔	مہریں	ترقیمے،مہریں،عرض دیدے، عابد رضا بیدار،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۱۹۹۸ء
۲۹۔	ترقیمے	ایضاً	ایضاً
۳۰۔	متفرق تحریریں	ایضاً	ایضاً
۳۱۔	اردو نثر پر ہندو مذہب کا اثر	ارمغان علمی،رفیع الدین ہاشمی وغیرہ،القمرانٹر پرائز ز،لاہور	۱۹۹۸ء
۳۲۔	کبیر کا الف نامہ	اردو مخطوطات،چغتائی،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ	۱۹۹۹ء
۳۳۔	حکیم مومن خاں مومن اور آزاد	مومن خاں مومن۔ایک مطالعہ، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی	۲۰۰۰ء
۳۴۔	مقدمہ واشاریہ	دربار اکبری، محمد حسین آزاد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی	۱۹۹۹ء
۳۵۔	مناظر عاشق ہرگانوی۔ تنقید کا رہنما مینار	مناظر عاشق ہرگانوی۔ناقد اور محقق، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، نرالی دنیا پبلی کیشنز،نئی دہلی	۲۰۰۱ء

(اصل مضمون میں مناظر صاحب نے خود اپنی طرف سے خاص ردوبدل کرلی ہے۔کتاب چھپوانے کے بعد میرے پاس بھیجی اور اپنی ترمیم وتنسیخ کے لیے معذرت کا خط بھی ارسال کیا۔

۳۶۔	ایک خط (عکس)	یادنامہ داؤدی، تحسین فراقی رجعفر بلوچ، لاہور	۲۰۰۳ء
۳۷۔	تدوین کے اصول ومدارج	تحقیق شناسی، رفاقت علی شاہد، لاہور	۲۰۰۳ء
۳۸۔	شاگردان رشک	ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ، تحسین فراقی رضیاء الحسن، لاہور	اکتوبر ۲۰۰۵ء

مضامین بہ زبان انگریزی

۱۔ اردو زبان و ادب سے متعلق (بہ حیثیت معاون) اے ہسٹری آف انڈین لٹریچر جلد ۸، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۱ء

۲۔ ورمن، شیو برت لال، انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر جلد ۵، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی ۱۹۹۲ء

۳۔ اردو ادب، انسائیکلوپیڈیا ایشیاٹیکا جلد ۴، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ،

بہ زبان فارسی

مثنوی و عشق، شاہ برکت اللہ، دانش نامۂ جہان اسلام، تہران

ادارت

گورکھ پور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے مجلّہ افکار نو کا مدیر برائے ۶۲۔۱۹۶۱ء و ۶۳۔۱۹۶۲ء

مضامین بہ زبان اردو

۱۹۵۰ء

۱۔ امتحان (افسانہ)	پندرہ روزہ الحسنات، رامپور	اگست، دوم
۲۔ طالوت جالوت (قرآنی قصہ)	ایضاً	ستمبر، اول

۱۹۵۱ء

۳۔ ظلم کی سزا (افسانہ)	الحسنات	اگست، دوم
۴۔ تحفہ (افسانہ)	ایضاً	ایضاً

۱۹۵۲ء

۵۔ نمائش گاہ (افسانہ)	ماہنامہ فردوس کانپور	
۶۔ بلبلے (افسانہ)	الحسنات	مارچ، دوم
۷۔ ایضاً	روزنامہ کوثر	۲۹ مارچ
۸۔ نیت کا پھل (افسانہ)	الحسنات	دسمبر، اول و دوم

۱۹۵۳ء

۹۔ ایک بات اور تین سوال (تمثیل)	ہفتہ وار غریب، کانپور	
۱۰۔ بی اے طالب علم کا عیسائی مبلغ سے مناظرہ	غریب	۹، ۲۳ اکتوبر۔ ۷، ۱۴ نومبر

(بہائی مشن شملہ نے اسی کو دیکھ کر "وکٹر آف گاڈ" سے خطاب کیا)

۱۱۔ مسئلہ ارتقا سے متعلق	ہفتہ وار الانصاف، الہ آباد	

۱۹۵۴ء

۱۲۔ غریب رامو (افسانہ)	ماہنامہ ساحل، پورنیہ	جون، جولائی
۱۳۔ کوئی بتلائے کہ ہم ...... (مزاحیہ)	ہفتہ وار نوجیون، بلند شہر	ستمبر

۱۴۔ عورت کیا ہے؟ حیات انسانی کے تین ادوار ہیں	ہفتہ وار پیغام، بنگلور	۲۴ ستمبر تا ۲۲ اکتوبر
۱۵۔ حسرت کا ایک شعر	ماہنامہ الہام، حیدر آباد	نومبر
۱۶۔ سودا کا ایک شعر	ایضاً	دسمبر
۱۷۔ پڑھا لکھا آدمی (طنزیہ)	روزنامہ نئی دنیا، دہلی	۲۴ دسمبر
۱۹۵۵ء[۳]		
۱۸۔ اردو کے تین شعر	ہفتہ وار لوح و قلم، پشاور	۱۲ اپریل
۱۹۔ ایک عیسائی مبلغ سے مناظرہ	ہفتہ وار اہل حدیث، سوہدرہ	یکم، ۱۶ جولائی
۲۰۔ ذوق کے دو اشعار	لوح و قلم	۲۱ اگست
۲۱۔ ایک بحر کے تین شعر	ایضاً	۶ ستمبر
۲۲۔ وحید مرزا پوری	ایضاً	۲۷ ستمبر
۲۳۔ جگر کا ایک شعر	الہام	ستمبر
۲۴۔ غالب کا ایک شعر	ایضاً	اکتوبر
۲۵۔ دو مقبول عام شعر	لوح و قلم	۵ اکتوبر
۲۶۔ ایک پس منظر میں دو شعر	ایضاً	دسمبر
۲۷۔ ذوق اور ان کے معاصر	ہفتہ وار پیام نو، ڈیرہ اسماعیل خاں	دسمبر
۱۹۵۶ء		
۲۸۔ ایک شعر، ایک گرہ	لوح و قلم	جنوری
۲۹۔ احادیث کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ	ہفتہ وار غریب، کانپور	۱۲۔۲۰ فروری
۳۰۔ ذوق کا نسب و عقیدہ	ماہنامہ تذکرہ، کراچی	اپریل
۳۱۔ ولی کا ایک شعر	الہام	اپریل
۳۲۔ اردو میں تجسیم نگاری	ایضاً	مئی
۳۳۔ ذوق کی تجسیم نگاری	ایضاً	جون
۳۴۔ ایک شعر	ایضاً	اگست
۳۵۔ مرزا غالب کے متعلق شگوفے	ایضاً	ستمبر
۳۶۔ ایضاً ۔ دوسری قسط	ایضاً	اکتوبر
۳۷۔ کلام ذوق میں تصرفات	ماہنامہ مشیر، کراچی	نومبر
۳۸۔ ایضاً ۔ دوسری قسط	ایضاً	دسمبر
۳۹۔ شفیق بہ حیثیت استاد	ہفتہ وار اردو، جونپور	دسمبر ۔ شفیق نمبر

۱۹۵۷ء

۴۰۔ دوہرے۔غالب و ذوق کے	الہام	فروری
۴۱۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد۔تحقیق کے آئینے میں	مشیر	فروری

۱۹۵۸ء

۴۲۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد پر ایک نظر	نگار لکھنو	مارچ
۴۳۔ ذوق کا نسب وعقیدہ	تذکرہ	اپریل
۴۴۔ ذوق کے متعلق بعض حکایتیں	ہفتہ وار ہماری آواز، کانپور	۱۲،۱۹ اپریل
۴۵۔ کلام ذوق میں تاثرات قرآنی	تذکرہ	مئی
۴۶۔ کلام ذوق میں انفرادی جذبات ومحسوسات	ایضاً	جون

۱۹۵۹ء

۴۷۔ ذوق۔عہد اکبر شاہی تک	ماہنامہ پیغام اودھ، پرتاب گڈھ	دسمبر
۴۸۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق	ماہنامہ ادیب، علی گڑھ	دسمبر

۱۹۶۰ء

۴۹۔ ذوق کے متعلق آزاد کے بعض بیانات	نگار	مارچ
۵۰۔ غالب، ذوق اور ناسخ	ایضاً	جولائی
۵۱۔ قصاید ذوق	ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر	جولائی
۵۲۔ ذوق کا استاد کون تھا؟	نگار	اگست
۵۳۔ قصاید ذوق	ایضاً	ستمبر
۵۴۔ ذوق اور فن موسیقی	ماہنامہ نیا دور، لکھنو	ستمبر
۵۵۔ گلشن بے خار کے دو ایڈیشن	پگڈنڈی	نومبر
۵۶۔ فوق بن ذوق	نگار	

۱۹۶۱ء

۵۷۔ ذوق اور علم نجوم ورمل	نیا دور	مارچ
۵۸۔ ذوق اور فن طب	ایضاً	اکتوبر
۵۹۔ ذوق کے آخری قصیدے	پگڈنڈی	اکتوبر
۶۰۔ آب حیات اور تحقیق	ماہنامہ شمع ادب، سلطان پور	اکتوبر، نومبر
۶۱۔ نازک خیالی بہ خیال آزاد	ایضاً	دسمبر

۱۹۶۲ء

۶۲۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا ابتدائی دور	نیا دور	اپریل
۶۳۔ اردو شعر و ادب ۔عہد بہمنی سے عہد قطب شاہی تک	شمع ادب	مئی
۶۴۔ ذوق کی مقبولیت میں کمی کے اسباب	پگڈنڈی	اگست
۶۵۔ اردو شاعری ۔دلی سے لکھنو تک	شمع ادب	اگست ستمبر
۶۶۔ ذوق اور علم تصوف	نیا دور	اکتوبر
۶۷۔ مراختہ	ماہنامہ آج کل ،دہلی	اکتوبر
۶۸۔ میر قمر الدین منت	شمع ادب	اکتوبر ،نومبر
۶۹۔ شاہ نصیر ۔لکھنو میں	ماہنامہ نگار پاکستان ،کراچی	نومبر

۱۹۶۳ء

۷۰۔ تذکرہ سرور	ہفتہ وار ہماری زبان ،علی گڑھ	۲۲ جنوری
۷۱۔ جوش ملیح آبادی	شمع ادب	جنوری فروری
۷۲۔ ظفر اور ذوق	ایضاً	مارچ اپریل
۷۳۔ کلام ذوق میں الحاق	ہماری زبان	۲۲ اپریل
۷۴۔ ذوق ۔ایک مطالعہ	ماہنامہ نگار ،رام پور	مئی
۷۵۔ شاہ نصیر کی دکن سے واپسی	ہماری زبان	۱۵ مئی
۷۶۔ گل عجایب	پگڈنڈی	جون
۷۷۔ کچھ ذوق سے متعلق	ہماری زبان	۱۰ جولائی
۷۸۔ ذوق اور اقبال	نیا دور	جولائی
۷۹۔ کلام ذوق میں الحاق	نگار پاکستان	اگست
۸۰۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں دہلی کی بزم سخن	پگڈنڈی	اکتوبر
۸۱۔ شاہ نصیر کی دکن سے واپسی	نگار پاکستان	
۸۲۔ مشاعرہ مرزا محمد تقی ہوس	ہماری زبان	۲۲ جولائی
۸۳۔ تذکرہ گردیزی	ایضاً	۱۵ اکتوبر ،۲۲ اکتوبر

۱۹۶۴ء

۸۴۔ کلب حسین خاں نادر	پگڈنڈی	فروری
۸۵۔ نیشاپوری خاندان کے شعرا	ہماری زبان	یکم مارچ

۸۶۔ کانپور کے ذخیرے	ایضاً	۱۵مارچ
۸۷۔ تحفۃ الشعرا مرتبہ حفیظ قتیل	نگار پاکستان	اپریل
۸۸۔ سلسلۃ الشعرا۔فہرست تلامذہ ناسخ	سہ ماہی نخلستان، اودیپور	اپریل تا جولائی
۸۹۔ نادر۔تصحیح واضافے	پگڈنڈی	مئی
۹۰۔ دیوان شاہ نیاز۔قلمی	ہماری زبان	۱۵مئی
۹۱۔ تذکرہ خاکسار	ایضاً	۲۲جون
۹۲۔ غلام حسین مظلوم	پگڈنڈی	جون
۹۳۔ قبول اور مطبوعات اردو	شمع ادب	جون
۹۴۔ کلام ناسخ بقول ناسخ	سہ ماہی اردو ادب، علی گڑھ	نمبرا
۹۵۔ سلسلۃ الشعرا۔تلامذہ ناسخ (دوسری قسط)	نخلستان	نمبر۲
۹۶۔ میر رشک کا مسلک تحریر	سالانہ افکار نو، گورکھ پور	۔
۹۷۔ کتب خانہ نواب معین الدولہ کے مخطوطات	ہماری زبان	۸اگست
۹۸۔ شاہ غلام اعظم افضل	شمع ادب	اگست
۹۹۔ محمد بخش شہید	پگڈنڈی	اگست
۱۰۰۔ کلام ناسخ میں متروک الفاظ	شمع ادب	سالنامہ
۱۰۱۔ فہرست کتب خانہ ٹوکیو یونیورسٹی	ایضاً،	ستمبر
۱۰۲۔ آنجہانی اور مرحوم	ہماری زبان	یکم اکتوبر
۱۰۳۔ بیاض رنجی	نیا دور	اکتوبر
۱۰۴۔ شیخ امداد علی بحر	پگڈنڈی	نومبر
۱۰۵۔ نواب حسین علی خاں اثر	ہماری زبان	۱۰نومبر، یکم دسمبر
۱۰۶۔ میر کی سیادت	ایضاً	۲۲نومبر
۱۰۷۔ جاپان میں اردو	ایضاً	۸دسمبر
۱۰۸۔ منظوم مطہر	ایضاً	۲۲دسمبر
۱۹۶۵ء		
۱۰۹۔ کلام ناسخ میں ہندوستانی عناصر	نیا دور	جنوری
۱۱۰۔ گویا ملیح آبادی	ہماری زبان	۱۵جنوری
۱۱۱۔ انیسویں صدی کے آخر کی خبریں	ایضاً	۸مارچ
۱۱۲۔ کلب حسین خاں نادر	ماہنامہ سروج، دہلی	مارچ

١١٣۔ چند نادر مخطوطات	ہماری زبان	۱۵ اپریل
١١٤۔ معتمد الدولہ کا خاندان	شمع ادب	اپریل
١١٥۔ میر لکھنو میں	ہماری زبان	۲۲اپریل
١١٦۔ محسنی کتب خانہ اجمیر کی چند کتابیں	ایضاً	۲۲ جون
١١٧۔ فارسی کا ایک نادر تذکرہ (مراۃ الخیال)	ہماری زبان	۱۸اکتوبر
١١٨۔ گلشن بیخار کے مختلف ایڈیشن	شمع ادب	نومبر، دسمبر
١١٩۔ مرزا حاجی قمر	نخلستان	--
١٢٠۔ سعیدیہ لائبریری کے نوادر	ہماری زبان	یکم دسمبر
١٢١۔ ناسخ کے حالات تذکروں کی روشنی میں	نیا دور	دسمبر

١٩٦٦ء

١٢٢۔ نواب امین الدولہ مہر	اردو ادب	نمبر ۱
١٢٣۔ غالب ذوق اور ناسخ	افکار، کراچی	غالب نمبر۔ فروری مارچ
١٢٤۔ فایق کی ایک فارسی تصنیف	ہماری زبان	۱۵اپریل، یکم جولائی
١٢٥۔ رسالہ انشائے اسرار فری میسن	ایضاً	۸ مئی
١٢٦۔ مشاعروں کے مختلف ادوار	پاسبان، بنگلور	۱۱اکتوبر
١٢٧۔ مصحفی کا سال ولادت	ہماری زبان	۲۲نومبر
١٢٨۔ مفتاح السرور عادل شاہی	ایضاً	۸دسمبر

١٩٦٧ء

١٢٩۔ میر حسن کے بیٹے ہماری زبان		۱۵جنوری
١٣٠۔ تلخیص محلا۔ دو قسطیں	اردو ادب	نمبر ۱، ۲
١٣١۔ انشاء اللہ خاں انشا	ہماری زبان	۱۵فروری
١٣٢۔ دفتر پریشان کا ایک قلمی نسخہ	ماہنامہ قومی زبان، کراچی	فروری
١٣٣۔ غازی الدین حیدر کی بادشاہت	ہماری زبان	۱۵اپریل
١٣٤۔ مصحفی کا سال ولادت	نگار پاکستان	اپریل
١٣٥۔ میر علی اوسط رشک	قومی زبان	جولائی
١٣٦۔ تذکرۂ خاکسار	اردو ادب	نمبر ۳
١٣٧۔ سودا کا سنہ ولادت	ماہنامہ ماہ نو، دہلی	اکتوبر
١٣٨۔ اشرف علی خاں فغاں	سہ ماہی تحریر، دہلی	

۱۳۹۔ تلخیص سراپا سخن پر تبصرہ   ہماری زبان، علی گڑھ   ۱۵ اگست

۱۹۶۸ء

۱۴۰۔ اردو ادب کے تحقیقی مقالات   اردو ادب   نمبر ۱

۱۴۱۔ کلام مصحفی کی دو اشاعتیں   ایضاً   نمبر ۲

(یہ مضمون میں نے ڈاکٹر نور الحسن نقوی کی فرمایش پر لکھا تھا۔ اس میں بعض مطالب ان کے فراہم کردہ ہیں۔)

۱۴۲۔ میاں جرأت   ماہنامہ سروج، دہلی   اپریل

۱۴۳۔ تدوین کے اصول و مدارج   سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ

۱۴۴۔ اردو میں تدوین۔ دیوان ناسخ، دیوان ذوق   قومی زبان   مئی

۱۴۵۔ انتخاب رزمی   ایضاً   جون

۱۴۶۔ اردو ادب میں تبصرے   اردو ادب   نمبر ۳

۱۴۷۔ قطعۂ منتخب   سہ ماہی اردو، کراچی   نمبر ۳

۱۴۸۔ اردو میں تدوین۔ دستور الفصاحت   قومی زبان   جولائی

۱۴۹۔ مولوی عبدالحق بہ حیثیت محقق   ایضاً   ستمبر۔ بابائے اردو نمبر

۱۵۰۔ اردو ادب کے قلمی معاونین   اردو ادب   نمبر ۴

۱۵۱۔ اردو میں تدوین۔ تذکرہ ابن طوفان   قومی زبان   اکتوبر

۱۵۲۔ اردو میں تدوین۔ گلشن ہند   ایضاً   نومبر

۱۵۳۔ معراج العاشقین کا مصنف۔ مولفہ حفیظ قتیل   ہماری زبان   ۱۵ نومبر

۱۵۴۔ اردو دواوین کی ترتیب اور تصحیح   ہمایوں، دہلی   جولائی

یہ مضمون ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے لکھ کر میرے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے۔

۱۹۶۹ء

۱۵۵۔ حیات غالب۔ ایک مطالعہ   اردو ادب   نمبر ۱۔ غالب نمبر

۱۵۶۔ آب حیات میں مرزا کے ذاتی حالات   فکر و نظر   نمبر ۲۔ غالب نمبر

۱۵۷۔ غالب کا مسلک تحریر   افکار نو، گورکھ پور   غالب نمبر

۱۵۸۔ دیوان غالب نسخہ مالک رام   قومی زبان   فروری۔ غالب نمبر

۱۵۹۔ نکات الشعرا سے متعلق چند حقایق   اردو ادب   نمبر ۲

۱۶۰۔ مولوی محمد عظیم اللہ رزمی   ہماری زبان   ۲۲ مئی، یکم جون

۱۶۱۔ مطبوعہ کربل کتھا سے متعلق   ایضاً   یکم مئی

۱۶۲۔ کچھ مخزن نکات سے متعلق   ایضاً   ۲۲ جون

۱۶۳۔ اردو میں تدوین گلشن سخن	قومی زبان	اگست
۱۶۴۔ کربل کتھا کا زمانہ	فکر ونظر	
۱۶۵۔ مرثیہ کی تحقیق سے متعلق چند امور	ہماری زبان	نومبر
۱۶۶۔ کربل کتھا کا زمانہ	قومی زبان	نومبر

۱۹۷۰ء

۱۶۷۔ قصہ مہرافروز ودلبر	اردو ادب	نمبر ۲
۱۶۸۔ آڑے ترچھے آئینے	سہ ماہی عصری ادب، دہلی	جولائی
۱۶۹۔ دیوان غالب، نسخہ عرشی زادہ۔ایک جائزہ	ہماری زبان	یکم اگست
۱۷۰۔ اشاریہ ہماری زبان	اردو ادب	نمبر ۳
۱۷۱۔ دیوان غالب بخط غالب۔ایک انکشاف	ہماری زبان	۱۵ستمبر
۱۷۲۔ نودریافت دیوان غالب کی تدوین	ایضاً	یکم اکتوبر
۱۷۳۔ دیوان غالب کا نودریافت مخطوطہ	ہماری زبان	۱۵ اکتوبر، ۲۲ اکتوبر، یکم نومبر
۱۷۴۔ بھوپال اور غالب مولفہ عبدالقوی دسنوی	ایضاً	۸نومبر
۱۷۵۔ دیوان غالب کا متنازع نسخہ	ایضاً	۲۲دسمبر
۱۷۶۔ معراج العاشقین کا مصنف پر تبصرہ	ایضاً	۱۵نومبر

۱۹۷۱ء

۱۷۷۔ دیوان غالب کے بھوپالی نسخے	ہماری زبان	۸فروری
۱۷۸۔ فضل الرحمان اسلامیہ کالج بریلی کی میگزین کا غالب نمبر	ایضاً	۸ مارچ
۱۷۹۔ گل رعنا کے سلسلے میں	ایضاً	۱۵مارچ
۱۸۰۔ بکٹ کہانی کا مصنف کون سا افضل ہے؟	ایضاً	یکم اپریل
۱۸۱۔ نودریافت دیوان غالب	ایضاً	۱۸اپریل
۱۸۲۔ قاعدہ ہندی ریختہ	اردو ادب	نمبر ۲
۱۸۳۔ برہمن کی کہانی	عصری ادب، دہلی	
۱۸۴۔ بکٹ کہانی کا مصنف افضل غازی پوری ہے؟	ہماری زبان	یکم مئی
۱۸۵۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی کی بمبئی میں اردو	ایضاً	۸مئی
۱۸۶۔ دیوان غالب کی بحث سے متعلق	ایضاً	۸مئی
۱۸۷۔ نودریافت دیوان غالب کی تصدیق کی بنیاد	ایضاً	۲۲مئی

۱۸۸۔ بکٹ کہانی کا مصنف	ایضاً	۲۲ جولائی
۱۸۹۔ نودریافت دیوان غالب کے سلسلے میں	ایضاً	یکم اگست
۱۹۰۔ قادر نامۂ غالب	ایضاً	۱۵ اگست
۱۹۱۔ مجلّہ سیفیہ کا غالب نمبر	ایضاً	۱۵ ستمبر
۱۹۷۲ء		
۱۹۲۔ قدیم متون کا مطالعہ	اردو ادب	نمبر ا
۱۹۳۔ پوربی (اودھی) کیا اردو	ایضاً	نمبر ۲
۱۹۴۔ ایک مراسلے کے جواب میں	ہماری زبان	۱۰ جنوری
۱۹۵۔ بکٹ کہانی کا نسخہ رام پور	ایضاً	۱۸ اپریل
۱۹۶۔ رسالہ گل کرسٹ	ایضاً	۲۲ جون
۱۹۷۔ اردو کے مسایل	پندرہ روزہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ	جلد ا نمبر ۴
۱۹۸۔ غالب کی تحریریں	ایضاً	جلد ا نمبر ۶
۱۹۷۳ء		
۱۹۹۔ قاعدۂ ہندی ریختہ کے بارے میں	ہماری زبان	۲۲ جولائی
۲۰۰۔ کچھ ڑ کے بارے میں	ایضاً	۸ نومبر
۲۰۱۔ اردو کیا ہے؟	ایضاً	۸،۱۵ دسمبر
۲۰۲۔ صحیفہ بشارت	ایضاً	۲۲ دسمبر
۲۰۳۔ اردو کے بعض ابتدائی نقوش	کانفرنس گزٹ	جلد ا نمبر ۲۳
۱۹۷۴ء		
۲۰۴۔ کچھ 'ش' کے بارے میں	ہماری زبان	۲۲ جنوری
۲۰۵۔ اردو کی آوازوں کے بارے میں	ایضاً	۱۵ فروری
۲۰۶۔ اردو کا لسانیاتی ادب	کانفرنس گزٹ	یکم مئی
۲۰۷۔ پوربی اردو کا آغاز وارتقا	ماہنامہ فروغ اردو لکھنو	اکتوبر ۷۴ء تا اکتوبر ۷۵ء
۱۹۷۵ء		
۲۰۸۔ سلطان جلیری کا اعتقادنامہ	ششماہی نوائے ادب، بمبئی	جولائی
۱۹۷۷ء		
۲۰۹۔ گلشن گفتار	ہماری زبان	۲۶ مئی
۲۱۰۔ گلشن راز	ایضاً	۱۵ جون، ۸ جولائی

۲۱۱۔ تذکرہ خاکسار	ایضاً	۸ جولائی
۲۱۲۔ تحفۃ الشعرا	ایضاً	۱۵ جولائی
۲۱۳۔ معاملات تحقیق	ماہنامہ شاعر، بمبئی	ہمعصر اردو ادب نمبر
۱۹۸۰ء		
۲۱۴۔ اردو۔ آخری عہد عالمگیری میں	سالنامہ ادبی مجلّہ جے پور	فروری
۲۱۵۔ دلّی۔ ایک جائزہ	سہ ماہی روشن، بدایوں	مارچ
۲۱۶۔ قصاید سودا کا ایک ماخذ	ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور	مارچ تا مئی
۲۱۷۔ دوست دار اور خلیل	شاعر	اپریل۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر
۱۹۸۱ء		
۲۱۸۔ گیان چند صاحب کے علمی معاملات	شاعر	نمبر ۵۔۶
۲۱۹۔ خالق باری اور اصول تدوین	اورینٹل کالج میگزین، لاہور	نمبر ۳،۴۔ شیرانی نمبر
۲۲۰۔ فانی کا نقطۂ نظر رباعیات کی روشنی میں	روشن بدایوں۔ فانی نمبر	جنوری
۱۹۸۲ء		
۲۲۱۔ دہلی میں اردو شاعری کا ابتدائی زمانہ	ادیب، علی گڑھ	جنوری تا مارچ
۲۲۲۔ شاہ عالم آفتاب	شاعر	نمبر ۲
۲۲۳۔ خواجہ وزیر	ایضاً	نمبر ۹
۲۲۴۔ شاگردان ناسخ	سہ ماہی اردو، کراچی	نمبر ۴
۱۹۸۳ء		
۲۲۵۔ شاگردان ناسخ۔ دوسری قسط	اردو	جنوری
۲۲۶۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر	ماہنامہ کاوش، کان پور	اپریل، مئی
۲۲۷۔ زبان اردو کی ابتدا	نوائے ادب	اکتوبر
۲۲۸۔ سب رس کے بارے میں	شاعر	
۲۲۹۔ فتح الدولہ برق	سالانہ وقار، علی گڑھ	
۲۳۰۔ شاگردان ناسخ۔ تیسری قسط	اردو	اکتوبر
۲۳۱۔ قطب مشتری کا مصنف	شاعر	نومبر، دسمبر
۱۹۸۴ء		
۲۳۲۔ کلام ناسخ بقول ناسخ	اردو ادب	جنوری
۲۳۳۔ اردو کی ابتدا سے متعلق	دو ماہی قرطاس، ناگ پور	جنوری، فروری

۲۳۴۔ عہدخسرو کی ہندوستانی بولیاں	روشن	جنوری تا مارچ
۲۳۵۔ اردو کی ابتدا	قرطاس	مارچ،اپریل
۲۳۶۔ ناسخ کے الہ آبادی شاگرد	سہ ماہی انکشاف،ہوڑہ	اپریل
۲۳۷۔ شیخ عبدالقدوس	سہ ماہی زبان وادب، پٹنہ	اپریل تا جون
۲۳۸۔ اردو کے ابتدائی نقوش	قرطاس	مئی، جون
۲۳۹۔ رضا کے بارے میں	سہ ماہی تناظر،نئی دہلی	جون،کالی داس گپتا نمبر
۲۴۰۔ بودھ گان ودوہا	سہ ماہی روح ادب،کلکتہ	اکتوبر تا دسمبر
۱۹۸۵ء		
۲۴۱۔ طرب ودلگیر	روشن	
۲۴۲۔ چنداین اور بیناست	نوائے ادب	اپریل
۲۴۳۔ فیروز بیدری	سہ ماہی ذوق نظر،حیدرآباد	جولائی
۲۴۴۔ فارسی پر قدیم اردو کے اثرات	سہ ماہی دانش،اسلام آباد	نمبر۲
۲۴۵۔ محمد حسین عطا خان تحسین	روح ادب	جولائی ۸۵ء تا مارچ ۸۶ء
۲۴۶۔ سرسید اور ہومیو پیتھی	سالانہ ضیاء،علی گڑھ	
۲۴۷۔ اردو کے ابتدائی نقوش	قرطاس	ستمبر تا دسمبر
۲۴۸۔ شاگردان ناسخ ۔برق وقبول	اردو	نمبر۳
۲۴۹۔ شاگردان ناسخ ۔شیر یدوقبول	اردو	نمبر۴
۲۵۰۔ دکنی کا آغاز وارتقا	سالانہ وقار،علی گڑھ	
۱۹۸۶ء		
۲۵۱۔ دکنی اردو کا آغاز وارتقا	نگار پاکستان	جنوری
۲۵۲۔ ہندی (اردو) کی پیش رفت	قرطاس	جنوری،فروری
۲۵۳۔ اردو کے ابتدائی نقوش	ایضاً	مارچ تا جون
۲۵۴۔ شاگردان ناسخ ۔گویا	اردو	نمبر ۱
۲۵۵۔ نقش فریادی سے دست تہ سنگ تک	نگار پاکستان	اپریل
۲۵۶۔ زبان ہندوی میں صوفیہ کی روایت	ماہنامہ تہذیب الاخلاق،علی گڑھ	جولائی
۲۵۷۔ اردو غزل کی ابتدا	اردو	نمبر۳
۲۵۸۔ اردو غزل کی ابتدا	ماہنامہ فکروآگہی،دہلی	اگست
۲۵۹۔ دکنی میں تیلگو الفاظ	تہذیب الاخلاق	ستمبر

۲۶۰۔ دستورالفصاحت	ماہنامہ سب رس، حیدرآباد	نومبر
۲۶۱۔ اردو پر تمل کے اثرات	اردو	اکتوبر تا دسمبر
۲۶۲۔ اردو کے ابتدائی نقوش	قرطاس	ستمبر ۸۶ تا فروری ۸۷ء

۱۹۸۷ء

۲۶۳۔ پہیلیاں	روشن	
۲۶۴۔ پندرھویں صدی عیسوی تک ہندوی میں اسلام کی اشاعت	مجلّہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ	نمبر ا، ۲
۲۶۵۔ اردو میں گیت اور نعت کی روایت	وقار، علی گڑھ	
۲۶۶۔ کبیر کا الف نامہ	اردو	جنوری تا مارچ
۲۶۷۔ مطبوعہ اردو تراجم	تہذیب الاخلاق	فروری
۲۶۸۔ تدوین اور عمل تدوین	سب رس	فروری
۲۶۹۔ غواصی معاصر وجہی	ایضاً	مئی
۲۷۰۔ علمی کتب کے مطبوعہ تراجم	قومی زبان	جون
۲۷۱۔ شمس الامرا کی سرپرستی میں تصانیف وتراجم	تہذیب الاخلاق	جولائی
۲۷۲۔ فرہنگ بحرالفضایل کا ایک اقتباس	روشن	
۲۷۳۔ اردو میں گیت اور نعت کی روایت	ماہنامہ مریخ، پٹنہ	جولائی تا اکتوبر
۲۷۴۔ اردو پہیلیاں	خدابخش جرنل پٹنہ	نمبر ۴۴
۲۷۵۔ اردو کی ابتدائی شاعری یا گیت	نخلستان	اکتوبر ۸۷ تا مارچ ۸۸

۱۹۸۸ء

۲۷۶۔ اردو پر تمل کے اثرات	اردو	جنوری تا مارچ
۲۷۷۔ برہان کی یوگ ساگر	قومی زبان	فروری
۲۷۸۔ اردو تحریر میں آوازوں کا اظہار	تہذیب الاخلاق	فروری
۲۷۹۔ ایضاً	ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد	فروری
۲۸۰۔ اردو کے ابتدائی نقوش	قرطاس	ستمبر ۸۷ تا فروری ۸۸ء
۲۸۱۔ اردو تحریر میں آوازوں کا اظہار	نخلستان	اپریل تا جون
۲۸۲۔ تاریخ ادب اردو کی تدوین سے متعلق	تہذیب الاخلاق	مئی
۲۸۳۔ اردو کا سب سے کثیر التصانیف مصنف	ایضاً	جولائی
۲۸۴۔ گوری شنکر لال اختر اور ان کے رسالے	قرطاس	مارچ تا اگست

۲۸۵۔ اردو پر تمل کے اثرات	زبان و ادب	جولائی تا ستمبر
۲۸۶۔ اردو کی ابتدائی شاعری یا گیت	اردو	جولائی تا ستمبر
۲۸۷۔ کبیر کا الف نامہ (متن)	ششماہی کتاب شناسی، اسلام آباد	نمبر ۲
۲۸۸۔ گن چھند	اخبار اردو	ستمبر
۲۸۹۔ قدسی کی لغت	سب رس	دسمبر
۲۹۰۔ اردو اور ہندی	اخبار اردو	دسمبر
۲۹۱۔ گوری شنکر لال اختر اور ان کے رسالے	تہذیب الاخلاق	دسمبر

۱۹۸۹ء

۲۹۲۔ اپنشد میگزین	ہماری زبان	۲۲ جون
۲۹۳۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ایک جائزہ	اردو	جنوری تا مارچ
۲۹۴۔ قدسی کی لغت	ماہنامہ صفا، حیدرآباد	اپریل تا جون
۲۹۵۔ دکنی ادب کا مطالعہ و تدریس	ششماہی فکر و تحقیق، دہلی	جنوری تا جون
۲۹۶۔ غالب کے تذکرہ نویس	سب رس	مارچ
۲۹۷۔ ایضاً	سہ ماہی غالب نامہ، دہلی	جولائی
۲۹۸۔ امیر خسرو کا ہندی کلام	قومی زبان	ستمبر
۲۹۹۔ اردو کی ابتدا سے متعلق ایک اہم نکتہ	تہذیب الاخلاق	ستمبر
۳۰۰۔ ایضاً	روزنامہ سنگم، پٹنہ	۲۷، اکتوبر
۳۰۱۔ قدسی کی لغت	نیا دور	ستمبر
۳۰۲۔ غالب کے تذکرہ نویس	قرطاس	ستمبر اکتوبر
۳۰۳۔ کبیر کا الف نامہ	آفتاب، علی گڑھ	

۱۹۹۰ء

۳۰۴۔ تمل اور اردو۔اشتراک کا ایک پہلو	تہذیب الاخلاق	جنوری
۳۰۵۔ انیسویں صدی میں سائنس اور سائنسی فکر	غالب نامہ	جنوری
۳۰۶۔ امثال اور مخزن امثال	شاعر	مارچ
۳۰۷۔ اردو اور جالیسی کی پدماوت	روشن	نمبر ۱
۳۰۸۔ خود اپنے بارے میں	ایضاً	نمبر ۲
۳۰۹۔ مطبوعہ کام کی فہرست	ایضاً	نمبر ۲
۳۱۰۔ رند پارسا	قومی زبان	اپریل

۳۱۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور مقالات تحقیق	ماہنامہ دایرے، کراچی	اپریل
۳۱۲۔ عبدالرحمٰن کی سندیس راسک	تہذیب الاخلاق	جون
۳۱۳۔ ابتدائی دور کے ہندوستانی مسلمان اور قرآن پاک کے تراجم	خدا بخش جرنل، پٹنہ	نمبر ۵۷ تا ۶۲

۱۹۹۱ء

۳۱۴۔ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کا تھیس ۔قصاید سودا	مجلّہ معیار و تحقیق، پٹنہ	نمبر ۲
۳۱۵۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کا تھیس ۔مقدمہ تاریخ زبان اردو		
۳۱۶۔ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا کا تھیس ۔میر نظام الدین ممنون		

۱۹۹۲ء

۳۱۷۔ جدید سنسکرت کا معروضی مطالعہ	ماہنامہ ندائے جمہور، علی گڑھ	جنوری
۳۱۸۔ اپنشدوں کے بارے میں	ایضاً	فروری
۳۱۹۔ میر رشک کا دیوان نظم مبارک	مجلّہ علوم اسلامیہ	نمبر ۱،۲
۳۲۰۔ اپنشد	ندائے جمہور	مارچ، اپریل
۳۲۱۔ رسالہ چہار انواع اور دیگر مخطوطات	خدا بخش لائبریری جرنل	نمبر ۶۹ تا ۷۴

۱۹۹۳ء

۳۲۲۔ ''انسان'' میں اقبال کی تین نظمیں	نیا دور	فروری
۳۲۳۔ کچھ اپنے بارے میں	ایضاً	ستمبر

۱۹۹۴ء

۳۲۴۔ زبان اردو، آوازوں سے رسم خط تک	ہفتہ وار قومی آواز، لکھنو	۲۰ فروری
۳۲۵۔ کچھ مولوی نذیر احمد کے بارے میں	فکر و نظر	نذیر احمد نمبر
۳۲۶۔ اردو نثر پر ہندو مذہب کا اثر	نیا دور	ستمبر
۳۲۷۔ کلیلہ و دمنہ	فکر و نظر	جلد ۳۱ نمبر ۳
۳۲۸۔ دولسانی کتبے	مجلّہ علوم اسلامیہ	جلد ۱۹ نمبر ۱،۲

۱۹۹۵ء

۳۲۹۔ عبدالرحمٰن کی سندیس راسک	سہ ماہی ترسیل، بمبئی	جلد نمبر ۱،۲
۳۳۰۔ چند قدیم سکے	سہ ماہی اردو، کراچی	نمبر ۱،۲،۳،۴
۳۳۱۔ سنسکرت متون کی کیفیت اور بعض ترجمے	ایضاً	ایضاً
۳۳۲۔ مسلمانوں کے واسطے سے بنگالی ادب کا ارتقا ۱۵۰۰ء تک	ایضاً	ایضاً

۱۹۹۶ء

۳۳۳۔فارسی اوراردو میں سنسکرت متون کے ترجمے اکبرشاہ و بہادرشاہ کے عہد میں	غالب نامہ، نئی دہلی،	سلور جوبلی نمبر۲ جولائی
۳۳۴۔ قصیدہ درلغات ہندی	سہ ماہی انشا حیدرآباد، پاکستان	جنوری تا جون
۳۳۵۔ ایضاً	مجلّہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	جلد۲، نمبر۱، ۲
۳۳۶۔فارسی اوراردو میں سنسکرت متون کے ترجمے اکبرشاہ اور بہادرشاہ کے عہد میں (قسط نمبر۱)	جرنل آف دی فیکلٹی آف آرٹس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	پہلا شمارہ ۹۶۔۱۹۹۵
۳۳۷۔ایک خط	مجلّہ یوم سرسید، بھوپال	۱۷ اکتوبر
۳۳۸۔ انیسویں صدی میں سائنس اور سائنسی طرزِ فکر کا اظہار	انشا حیدرآباد	جولائی تا دسمبر

۱۹۹۷ء

۳۳۹۔ اردو پر تمل کے اثرات	خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ	نمبر ۱۰۷
۳۴۰۔ انیسویں صدی میں سائنس اور سائنسی طرزِ فکر کا اظہار (قسط نمبر۲)	انشا، حیدرآباد	جنوری تا جون
۳۴۱۔ حکیم محمد احسن اللہ خاں	ششماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی	جنوری تا جون
۳۴۲۔ ڈاکٹر وحید قریشی اور مقالاتِ تحقیق	خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ	نمبر ۱۰۷
۳۴۳۔ اپنشد میگزین	ایضاً	نمبر ۱۰۹

۱۹۹۸ء

۳۴۴۔ بیاضِ غالب کی بحث	کتاب نما، نئی دہلی	فروری
۳۴۵۔ دیوان غالب مرتبہ مالک رام	جامعہ، نئی دہلی	جنوری تا مارچ (غالب نمبر)
۳۴۶۔ اردو اور ہندوستانیت	سہ ماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی	جنوری تا جون
۳۴۷۔ فرہنگ کبیر	ایضاً	جولائی تا دسمبر
۳۴۸۔ فکر و تحقیق کے دوسرے شمارے پر تبصرہ	ایضاً	ایضاً
۳۴۹۔ اردو ۱۸۰۰ تا ۱۹۱۰ء	قومی زبان	اکتوبر
۳۵۰۔ انیسویں صدی میں سائنس اور سائنسی طرزِ فکر کا اظہار (تیسری قسط)	سہ ماہی انشاء، حیدرآباد سندھ	جنوری تا جون

۱۹۹۹ء

۳۵۱۔ فرہنگ کبیر	پندرہ روزہ مغربی بنگال، کلکتہ	یکم ستمبر تا ۱۵ اکتوبر

۳۵۲۔ غالب کا مسلک تحریر	سہ ماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی	جولائی تا ستمبر
۳۵۳۔ اردو ۱۸۰۰ء تا ۱۹۱۰ء (آخری قسط)	قومی زبان	اکتوبر ۱۹۹۹ء
۳۵۴۔ کبیر کا الف نامہ	سہ ماہی اردو، کراچی	جنوری تا دسمبر ۱۹۹۹ء
۲۰۰۰ء		
۳۵۵۔ گیتا کے اردو تراجم اور شیو برت لال	نیا دور لکھنو	جولائی
۳۵۶۔ عمل تدوین اور تدوین متون	سہ ماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی	اپریل، مئی، جون ۲۰۰۰
۳۵۷۔ بیاض غالب کی بحث	سطور، ملتان	اگست ۲۰۰۰
۳۵۸۔ مفتاح السرور عادل شاہی میں ادویہ مفردہ کے نام بہ زبان ہندی	سہ ماہی اردو، کراچی	جنوری تا دسمبر ۲۰۰۰
۲۰۰۱ء		
۳۵۹۔ جیوتش کے دبستان	سطور، ملتان	کتابی سلسلہ نمبر ۳، نومبر
۲۰۰۳ء		
۳۶۰۔ لائے کہاں سے دنیا مثل نظیر اس کا	فکر و نظر، علی گڑھ۔ سرور نمبر	نومبر
۳۶۱۔ پروفیسر گیان چند کے مقالے سے متعلق	انگارے، ملتان	بارھویں کتاب۔ دسمبر
۲۰۰۶ء		
۳۶۲۔ تاریخ گوئی سے متعلق کتابیں	فکر و نظر، اسلام آباد	جولائی، ستمبر
۲۰۰۷ء		
۳۶۳۔ دو اہم معرکے	فکر و تحقیق، نئی دہلی	جولائی، ستمبر جلد ۱۰، نمبر ۳

نمبر شمار	ماہ و سال	جلسہ/مذاکرہ	مقام	مقالہ/تقریر
۱۔	۸ فروری ۱۹۷۰ء	کل ہند مشاعرہ، مولانا آزاد ٹیکنیکل ہائی اسکول	انجمن شہید، اعظم گڑھ	صدارت
۲۔	اکتوبر ۱۹۸۰ء	بین الاقوامی صد سالہ تقریبات حافظ محمود شیرانی	لاہور	خالق باری کی تدوین
۳۔	۱۹۸۳ء	بین الاقوامی غالب سیمینار، غالب انسٹی ٹیوٹ	دہلی	امام بخش صہبائی
۴۔	فروری ۱۹۸۵ء	جنوب ایشیائی سیمینار، خدا بخش لائبریری پٹنہ	علی گڑھ	مخطوطہ شرح سکندر نامہ
۵۔	جنوری ۱۹۸۶ء	کل ہند سیمینار۔ راجندر سنگھ بیدی و فیض احمد فیض	گورنمنٹ کالج ٹونک	فیض کی شاعری
۶۔	۲۹ ستمبر تا یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء	اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر۔ کل ہند سیمینار اردو قواعد	لکھنو	اردو قواعد
۷۔	نومبر ۱۹۸۶ء	شعبہ جدید السنہ ہند، مسلم یونیورسٹی۔ نیشنل سیمینار تقابلی ادب	علی گڑھ	اردو پر تمل کے اثرات

۸۔	فروری ۱۹۸۶ء	جنوب ایشیائی سیمینار، خدا بخش لائبریری پٹنہ	دہلی	کبیر کا الف نامہ
۹۔	۱۹۸۶ء	بین الاقوامی غزل سیمینار، دہلی اردو اکیڈمی	دہلی	اردو غزل دسویں صدی عیسوی تک
۱۰۔	۱۱ تا ۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء	شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	ہندی میں اسلام کی اشاعت نویں صدی ہجرت تک
۱۱۔	جنوری ۱۹۸۷ء	کل ہند ریسرچ کانگریس، خدا بخش لائبریری	پٹنہ	قصاید سودا مرتبہ عتیق احمد صدیقی
۱۲۔	مارچ ۱۹۸۷ء	شعبۂ اردو اسلامیہ یونیورسٹی	بہاول پور	عہد خسرو کی بولیاں
۱۳۔	ایضاً	اسلامیہ کالج۔ یوم غالب	ایضاً	تقریر بہ حیثیت مہمان خصوصی
۱۴۔	ایضاً	اردو مجلس	ایضاً	اردو میں گیت و نعت کی روایت
۱۵۔	اپریل ۱۹۸۷ء	شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی	کراچی	اردو کی ابتدا
۱۶۔	ایضاً	غالب لائبریری	کراچی	تقریر بہ حیثیت مہمان خصوصی
۱۷۔	دسمبر ۱۹۸۷ء	اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر۔ کل ہند سیمینار۔ تحریر	لکھنو	اردو تحریر میں آوازوں کا اظہار
۱۸۔	۱۹۸۷ء	دہلی اردو اکیڈمی۔ بین الاقوامی سیمینار	دہلی	اردو میں گیت و نعت
۱۹۔	جنوری ۱۹۸۸ء	کل ہند ریسرچ کانگریس۔ خدا بخش لائبریری	پٹنہ	میر نظام الدین ممنون پر تبصرہ
۲۰۔	دسمبر ۱۹۸۸ء	بین الاقوامی غالب سیمینار، غالب انسٹی ٹیوٹ	دہلی	غالب تذکروں میں
۲۱۔	جنوری ۱۹۸۹ء	کل ہند ریسرچ کانگریس، خدا بخش لائبریری	پٹنہ	مقدمہ تاریخ زبان اردو پر تبصرہ
۲۲۔	فروری ۱۹۸۹ء	مقتدرہ قومی زبان	اسلام آباد	اردو میں جدید تحقیقات
۲۳۔	ایضاً	جلسہ بہ مکان جناب ماجد صدیقی	اسلام آباد	اردو کی موجودہ صورت حال
۲۴۔	مارچ ۱۹۸۹ء	غالب لائبریری	کراچی	ہندوستان میں تحقیقی کام
۲۵۔	دسمبر ۱۹۸۹ء	بین الاقوامی غالب سیمینار: غالب انسٹی ٹیوٹ	دہلی	انیسویں صدی میں سائنسی فکر
۲۶۔	فروری ۱۹۹۰ء	بین الاقوامی حافظ محمود شیرانی سیمینار۔ غالب انسٹی ٹیوٹ	دہلی	پنجاب میں اردو۔ تجزیہ
۲۷۔	۱۹۔۲۰ مارچ ۱۹۹۰ء	کل ہند سیمینار۔ متن اور تدریس متن بنارس ہندو یونیورسٹی	وارانسی	دستور الفصاحت۔ جائزہ
۲۸۔	۱۸۔۱۹ اگست ۱۹۹۱ء	کل ہند داتا دیال شیو برت لال ورمن سیمینار	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	مہتمم سیمینار کی حیثیت سے مقالہ
۲۹۔	۱۸ تا ۲۰ اگست ۱۹۹۱ء	مولانا آزاد لائبریری میں نمائش کتب شیو برت لال ورمن	علی گڑھ	جملہ کتابیں، تصاویر وغیرہ فراہم کیں
۳۰۔	۷ فروری ۱۹۹۲ء	اورینٹل کالج	لاہور	اردو کی ابتدا کا مسئلہ
۳۱۔	۶، ۷ نومبر ۱۹۹۳ء	نیشنل سیمینار شعبہ جدید السنہ ہند مسلم یونیورسٹی۔ بنگالی ادب	علی گڑھ	مسلمانوں کے واسطے سے بنگلہ ادب کا ارتقا ۱۵۰۰ء تک
۳۲۔	۷ فروری تا ۵ مارچ ۱۹۹۴ء	یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کے لیے تربیتی نصاب۔ اردو ادب ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک	علی گڑھ	بہ حیثیت کوآرڈینیٹر اہتمام کیا اور بعض لیکچر دیے

۳۳۔ ۲۸ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء ترقیموں، عرض دیدوں اور مہروں پر کل ہند خدابخش سیمینار	پٹنہ	ترقیموں، مہروں اور متفرق تحریروں پر تین مقالے
۳۴۔ ۲۴ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء ہندی الاصل مذاہب سے متعلق بین الاقوامی خدابخش سیمینار	دہلی	سنسکرت متون اور بعض ترجمے
۳۵۔ ۱۸ اپریل ۱۹۹۵ء شعبہ سنسکرت، مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	عہد عالمگیری میں فارسی، اردو میں سنسکرت متون کے تراجم
۳۶۔ ۳، ۴ مئی ۱۹۹۵ء شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ کل ہند رشید احمد صدیقی سیمینار	دہلی	ایک جلسے کی صدارت
۳۷۔ ۱۳۱ اگست ۱۹۹۶ء شعبہ جدید السنہ ہند، مسلم یونیورسٹی ---بنگالی عوامی گیت	علی گڑھ	جلسے کی صدارت
۳۸۔ ۱۷ تا ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات اردو زبان اور ادبی نظریات پر	نئی دہلی	اردو اور ہندوستانیت
۳۹۔ نومبر ۱۹۹۷ء غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔ حکیم مومن خاں مومن کی شاعری		حکیم مومن خاں مومن کی شاعری
۴۰۔ نومبر ۱۹۹۸ء شعبہ اردو، مدراس یونیورسٹی، دیلیل قتیل جمیل یادگاری خطبات	چنئی	پہلا خطبہ: دیلیل اور ان کی علمی خدمات دوسرا خطبہ: برادران دیلیل کی ادبی خدمات
۴۱۔ ۱۲ فروری ۱۹۹۹ء شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔ غالب سیمینار		غالب کا مسلک تحریر

حواشی

۱؎ اس وقت سے نوجیون وغیرہ میں مضامین چھپنے لگے۔
۲؎ اس طور پر تحریر تحسین اور تنقید میں الہام میں "پرکھ" کے عنوان سے مدتوں چھپتی رہیں۔
۳؎ اس سال سے نگار میں ذوق سے متعلق تحقیقی مضامین شائع ہونے لگے۔

سرسید کا سفرنامہ ''مسافرانِ لندن''

پروفیسر اصغر عباس

سرسید ۱۸۶۹ء کے موسمِ بہار میں ایک پُر جوش زائر کی طرح یکم اپریل کو بنارس سے عازمِ لندن ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ذاتی مددگار عظیم اللہ عرف چھجو نیز ان کے ایک قریبی شناسا مرزا خداداد بیگ تھے۔ سرسید کے پہلے سوانح نگار جی۔ ایف۔ آئی گراہم کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ مرزا خداداد بیگ بمبئی سے ان کے شریکِ سفر ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید کے آغازِ سفر سے خداداد بیگ ان کے رفیقِ سفر تھے۔

اس سفر کا مقصد برصغیر کے تہذیبی مزاج کی تجدید اور اس کو جنت نظیر بنانے کی دھن تھی۔ اس زمانے میں لندن دنیا کا واحد شہر تھا جس نے اپنے عزم و استقامت کا لوہا ساری دنیا سے منوا لیا تھا۔ یہ شہر عالمی تہذیبوں کا مقامِ اتصال و ارتباط بنا ہوا تھا، اور عالم میں انتخاب تھا اور سرسید کا خیال تھا کہ جہاں کوئی چراغاں ہے وہ اپنا ہی چراغاں ہے۔

اس زمانے میں برصغیر میں مشرق و مغرب کے تہذیب و علوم کے مختلف دھاگے ایسے الجھے ہوئے تھے جو سلجھنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور انھیں سلجھانے کے لیے کوئی آگے بھی نہیں بڑھ رہا تھا۔ اس صورتِ حال نے برصغیر کو خاصا اذیت بدوش بنا دیا تھا لیکن اس مسئلہ کے حل کے لیے اپنی حیرت ناک خواہشات کے ساتھ سرسید نے کمرِ ہمت چست باندھی۔ حصولِ مقصد کی یہ دھن ان کے پورے وجود پر غالب تھی۔ اس میں بے پناہ قوتِ تخیل تھی اور استنباطِ نتائج کی بے صبری کبھی ہٹ اور کبھی طلبِ شدید سے جوش و وحشت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ سرسید لندن میں ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء تک رہے لیکن اس عرصے میں شاید ہی ان کا کوئی دن ایسا ہو جو اپنے مقصد سے خالی رہا ہو یا شاید ہی کوئی رات ایسی ہو جو اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے نہ گزری ہو۔

سرسید کے نفائس علمی اور تہذیبی میں ان کا سفرنامہ مسافرانِ لندن بھی ہے۔ اس سفرنامے کو اردو کے ان سفرناموں کے پیمانے پر ناپا نہیں جا سکتا جو قاری کو دور دراز کے اقالیم کی مزید ار سیر کروا دیتے ہیں۔ یہ سفرنامہ برصغیر کے ایک عظیم سپوت، ایک مجاہد، ایک مدبر، ایک مصلح، ایک معلمِ دینیات، ایک تاریخ داں اور ایک ماہرِ تعلیم کی سیرت گری اور اس کے انداز اور اس کے تہذیبی شعور کی مسافر بن کر لندن کے ذریعہ صورت گری ہے۔ سرسید زمانۂ حال کے جیتے جاگتے لمحوں پر یقین رکھتے تھے۔ وہ عصری علوم کے پیاسے تھے اور دانشِ حاضر کے متلاشی تھے۔ وہ برصغیر کی شناخت کے لیے سرگرداں تھے اور اسی کی تلاش میں وہ عازمِ لندن تھے۔ یہ سفرنامہ اس زمانے کے حالات سے نپٹنے کے لیے لکھا جا رہا تھا۔ اسی لیے یہ سرسید کے ذہنی اور باطنی واردات کا بیان بھی بن گیا ہے۔

اثنائے سفر میں چاہے مصر کی نہروں کا نظام ہو یا پیرس کے نگار خانے ہوں یا لندن کے عجائبات ہوں، کیمبرج یونیورسٹی، انڈیا

آفس لائبریری، انجمنِ کلب، مدارسِ نسواں، اربابِ کمال کی ملاقات، برٹش میوزیم، انجینئرنگ کی ترقیات، وچسٹر کالج، پل کا افتتاح، جنگی جہازوں کی تیاری، توپوں کا دغنا، عام کاری گروں کی صنعت وحرفت لندن کا لبرل ماحول سب کو انھوں نے وارفتگی سے دیکھا اور بار بار انھیں اپنے اہل وطن یاد آئے۔ سرسید کا یہ سفرنامہ اردو کے تمام سفرناموں سے اس لیے بھی علیحدہ ہے کہ جس مصنف نے اسے لکھا ہے وہ اردو کی تہذیبی تاریخ میں اب تک منفرد ہے اور یہ تو کہتے ہی ہیں کہ جیسا سفرنامہ نگار ویسا اس کا سفرنامہ۔

سرسید سے قبل انگلستان کے جتنے سفرنامے لکھے گئے ہیں ان میں لندن کی تعریف کے پل باندھے گئے ہیں۔۱۷۶۵ء میں جب شیخ اعتصام الدین بن تاج الدین انگلستان گئےتو وہ لندن کو دنیا کا سب سے آباد، اچھا اور معمور شہر بتاتے ہیں۔۱۷۹۹ء میں میر لندنی ابوطالب اصفہانی جب لندن گئےتو وہ بھی شہر کے حسینوں کی مدح میں شعر پر شعر کہے جاتے ہیں۔عبادت بریلوی کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا سفرنامہ سیاحت نامہ مصنفہ نواب کریم خاں ہے۔ وہ یکم دسمبر ۱۸۳۹ء کو کشتی کے ذریعہ دلی سے کلکتہ روانہ ہوئے اور وہاں سے یکم مارچ ۱۸۴۰ء کو عازمِ انگلستان ہوئے وہ بھی لندن کو رشکِ فردوس لکھتے ہیں۔ پروفیسر تحسین فراقی کی تحقیق کے مطابق نواب کریم خاں کی لندن روانگی سے کم وبیش دوڈھائی برس قبل ۳۰ مارچ ۱۸۳۶ء کو یوسف خاں کمبل پوش کلکتہ سے لندن روانہ ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں لندن وارد ہوئے۔ انگلستان کی سیاحت کے بعد یہ سفرنامہ عجائباتِ فرنگ تاریخ یوسفی کے عنوان سے ۱۸۴۷ء میں مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوا۔۱۸۵۶ء میں معزول شاہ اودھ نے مسیح الدین علوی کاکوروی کو اپنا وکیل بنا کر ۱۸ جون ۱۸۵۶ء کو دربار انگلستان میں بھیجا تھا۔ ان کا سفرنامہ سفیرِ اودھ کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان سفرنامہ نگاروں کے محرکات سفر دوسرے ہیں۔ یہ سب انگلستان کے حسن وجمال وہاں کی صفائی ستھرائی سے مرعوب ہیں۔ یہی نہیں شبلی تو خدا کی شان دیکھنےلندن کبھی نہیں گئے لیکن ۱۸۹۲ء کے رمضان المبارک میں جب انھوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو اپنے سفرنامہ روم مصر، شام میں غلطہ کا ذکر کرتے ہوئے جہاں انگریزوں کی بود و باش تھی۔ لکھتے ہیں: ''غلطہ کو دیکھو تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دکانیں بلند اور آراستہ، سڑکیں وسیع اور ہموار، کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔ برخلاف اس کے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل ...... حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے۔''

لندن کے سفر میں سرسید ایک ہندوستانی کی حیثیت سے چیزوں کا مشاہدہ کر رہے تھے وہ ہر مفید چیز کو اپنانا چاہتے تھے جو دوسرے ملکوں چاہے مصر میں ہو، فرانس میں ہو یا انگلستان میں ہو، اسی لیے وہ دوسرے ملکوں میں جو کچھ دیکھتے ہیں اس کا موازنہ برصغیر سے کرنے لگتے ہیں۔

بنارس سے انگلستان جاتے ہوئے انھوں نے جہاں جہاں قیام کیا یا جن مقامات سے گزرے ان کی تفصیلات بھی وہ اس سفرنامہ میں بیان کرتے ہیں۔ اس سفرنامہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں سفر کی تمام جزئیات کے باوجود ان کی اپنی شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے اور اس میں ایک نیم ڈرامائی اور قارئین سے براہ راست گفتگو کا انداز نمایاں ہے جیسے وہ غیر شعوری طور پر اردو میں رپورتاژ کی اساس رکھ رہے ہوں۔

دورانِ سفر جب وہ بیلگام ریلوے سٹیشن پر پہنچےتو وہاں پانی کی بمبیلوں کا انتظام دیکھا جس سے ریل کے مسافروں کو بہت آرام

تھا اور اس قسم کی سبیلیں کا متی سے بمبئی تک مختلف سٹیشنوں پر موجود تھیں، اس وقت انھیں شمالی ہند کے ریلوے سٹیشن یاد آئے اور افسوس کیا کہ ایسا انتظام علی گڑھ اور ہاتھرس کے ریلوے سٹیشنوں پر بھی ہونا چاہیے۔ لکھتے ہیں:

''زندگی اور مال و دولت اپنے آرام کو نہیں ہے بلکہ اوروں کے آرام پہنچانے کے لیے ہے۔''

بمبئی میں جب وہ پارسیوں کو دیکھتے ہیں تو وفورِ مسرت سے لکھتے ہیں کہ:

''پارسیوں نے البتہ قومی ترقی خوب کی ہے۔ تمام پارسی کیا بڑا اور کیا چھوٹا سب ایک وضع کی پوشاک پہنتے ہیں۔ نہانا اور پوشاک بدلنی اور صفائی سے رہنا بالکل اختیار کیا ہے۔ اولوالعزمی بھی ان میں بہت ہے۔ تجارت اور نوکری کو دور دور جاتے ہیں۔ شائستگی اور تربیت میں روز بروز ترقی کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی تربیت کی طرف متوجہ ہیں۔ ہر ایک پارسی انگریزی پڑھا ہوا ہے۔ بایں ہمہ اپنے مذہب کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ غرض کہ بمبئی میں مجھے پارسی بہت پسند آئے اور انھوں نے نہایت عمدہ طرح پر قومی ترقی شروع کی ہے۔''

بہ خلاف اس کے بمبئی میں جب وہ رحمت اللہ سلیمان میمن سوداگر کی دکان پر ٹھہرے تو انھوں نے اس کو ترغیب دی کہ ''میمنوں نے جو متفرق چھوٹے چھوٹے نامعقول صرف نام کے لیے مدرسے بنا رکھے ہیں ان کو موقوف کریں اور سب میمن مل کر ایک بڑا اور نہایت عمدہ عربی کالج بنا دیں ...... میمنوں میں بہ جز اس کے کئی اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عربی عمامے باندھتے ہیں اور بگھیوں میں چڑھتے ہیں اور اپنے نام اور شیخی کے پیچھے مرتے ہیں اور کچھ قومی ترقی نہیں کی۔''

سرسید جس جہاز میں بمبئی سے لندن کے لیے ۱۰ر اپریل ۱۸۶۹ء کو روانہ ہوئے اس میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے انگریز تو تھے لیکن ان کی طرف کا کوئی انگریز مسافر نہیں تھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ''اس سبب سے میں نہیں جان سکتا کہ جب یہ صاحب لوگ ہندوستان میں تھے تو ان کا مزاج اور اخلاق کیسا تھا۔ مگر جہاز میں سب کا مزاج اور اخلاق نہایت اچھا تھا۔ ہر موقع پر گڈ مارننگ، اور تھینک یو کہتے ہیں۔'' سرسید ہندوستانی صاحبان انگریز پر لطیف طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یا تو یہ صاحبان ہندوستان میں بھی ایسے خوش مزاج ہوں گے یا آب و ہوا کے اختلاف کے سبب یہ ہوگا۔ اس لیے کہ سمندری ہوا نہایت صحت بخش ہے۔'' سرسید ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے امتیاز کو ناپسند کرتے تھے اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان باہم محبت و مؤدت کے لیے کوشاں تھے۔

اسی جہاز پر لیفٹیننٹ جے بی لارنس بھی تھے جو مدراس میں تعینات تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ ''میرا کام توپ مارنے کا ہے، میں مشنری نہیں ہوں لیکن میں نے مدراس میں سنا ہے کہ تین مذاہب ہندو، عیسائی اور مسلمان سچے ہیں، لیکن میرے نزدیک سچا مذہب صرف ہمارا ہے۔ اسی لیے خدا کی مہربانی سب سے زیادہ انگریزوں پر ہے۔'' انھوں نے بحرِ وبر پر انگریزوں کی بالادستی کا ذکر کیا۔ سرسید نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب باتیں دنیا کے کاموں سے متعلق ہیں، ان سے مذہب کے سچے اور جھوٹے ہونے کا کوئی واسطہ نہیں، یہ سن کر لارنس چپ ہو رہے۔ وہ سمجھے کہ اب بات ختم ہوگئی اس لیے کہ آپس کی صحبت اور ملاقات میں مذہبی گفتگو کو سرسید ناپسند کرتے تھے۔ لارنس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ مذہب کی طرف بہت متوجہ ہیں اس لیے منکسر، با اخلاق

اور بموجب اصول اپنے مذہب کے غیروں سے محبت کرنے والے ہوں گے لیکن بعد میں سرسید کی یہ رائے ان کے متعلق قائم نہیں رہی۔

میجر ڈاڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ناگپور بھی اسی جہاز میں تھے، وہ سرسید سے بہت اخلاق سے ملے۔ وہ گھنٹوں آ کر ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ سرسید ان کو نہایت مہذب اور بااخلاق آدمی خیال کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: ''میں ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں مگر تعصب کو ایک بڑا نقص اخلاقِ انسانی میں اور نیچر یعنی حکمتِ الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں تو ایسے اچھے آدمی میں جیسے کہ میجر ڈاڈ صاحب ہیں، میں ایسا نقص کیوں کر خیال کر سکتا تھا، مگر ایک دن اتفاقیہ یہ ذکر آیا کہ فلاں صاحب باوصف بڑی لیاقت کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اس لیے نہیں ہوئے کہ شاید وہ لامذہب ہیں اور کسی مذہب کے سچے ہونے کا یقین نہیں رکھتے۔ میں نے کہا کہ ''میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں، جو لامذہب ہوں۔ کہنے لگے، کیوں؟ میں نے کہا جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہیں تو مذہبی آدمی کا افسرِ تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب عام تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔ یہ بات سن کر متعجب سے ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے مشرک، بت پرست، خداپرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے، اسی طرح گورنمنٹ کو اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے۔ جب ہی گورنمنٹ ظل اللہ اور افسر تعلیم معلم صفت من صفات اللہ ہو سکتا ہے۔''

اسی جہاز میں ان سے ایک پارسی گجراتی نوجوان سے ملاقات ہوئی جو نہایت شستہ اردو میں ان سے بات چیت کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ گجراتی زبان میں بہت سے فارسی لفظ ہیں جو ذرا سے تغیر میں گجراتی اردو ہو جاتی ہے۔ سرسید کا جہاز جب عدن پہنچا تو یہاں بازار کے لوگ اور سمالی قوم کے لوگوں کو انھوں نے اردو بولتے دیکھا تو لکھا کہ ''کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا۔ سب اردو میں انجام ہو سکتا ہے۔ الحمدللہ کہ عدن تک تو اردو زبان کی شہنشاہی قائم ہے۔'' بعد میں جب ترکی جاتے ہوئے شبلی کا جہاز ۱۳ مئی ۱۸۹۲ء کو سوئز پہنچا اور تین چار گھنٹے کے لیے ٹھہرا اور جہاز پر مصری عرب، پنیر، کھجور اور روٹیاں بیچنے کے لیے لائے، ان میں سے ایک نے شبلی کو ہندوستانی خیال کر کے اردو میں باتیں کرنی شروع کیں۔ شبلی لکھتے ہیں کہ ''مجھ کو تعجب ہوا اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اردو کی عالم گیری پر مجھ کو اور تعجب ہوا۔''

عدن میں سرسید کی ملاقات ایک مارواڑی تاجر سے ہوئی، اس کی زبانی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہندو آبادی یہاں باعزت زندگی گزار رہی اور ان کے عدن میں تین مندر ہیں اور عدن تک ہندو آتے جاتے ہیں۔ جہاز میں بیٹھنے سے ان کی ذات و مذہب میں کوئی فرق نہیں پڑتا، تو انھیں نہایت خوشی ہوئی۔ انھوں نے دعا کی کہ ''خدا ہمارے ملک (شمالی ہند) کے ہندوؤں کو بھی یہ دن نصیب کرے۔''

عدن میں دو دکانیں انھیں بُھٹے بیچنے والوں کی دکھائی دیں۔ یہاں انھوں نے ایک نان بائی سے پراٹھے پکوائے بالکل ویسے ہی پراٹھے جیسے کہ دہلی میں قطب صاحب کے علاقے میں بکتے ہیں۔ عدن میں یہ سب دیکھ کر انھیں اپنا وطن ہندوستان یاد آیا۔

عدن تک سفر میں انھیں کوئی عجیب جانور سمندر میں دکھائی نہیں دیا۔ صرف تین جانوران آبی، فاسفورس، جیلفش، جس کو جہاز کے خلاصی جھنا کہتے ہیں اور ایک پرند مچھلی دکھائی دی۔ ان جانوروں کو دیکھ کر سرسید ایک عجیب نوع کی مسرت محسوس کرتے ہیں اور ان

سب کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔

اسی جہاز میں مس کارپنٹر بھی تھیں جو ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں چار بار ہندوستان آ چکی تھیں۔ انھوں نے سرسید سے درخواست کی کہ وہ ہندوستانی خواتین کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ان کی نوٹ بک میں اپنی رائے لکھ دیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھ کو بڑودہ'' دخانی جہاز میں، جب کہ میں لندن کو جاتا تھا، مس کارپنٹر سے ملاقات کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ جب میں نے ان کا نام اوران کی کوششوں کا حال بہ نسبت تعلیم ہندوستانی عورات کے سنا تھا، میں بہت مشتاق ان کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان سے ملاقات ہوگئی۔ ان کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب اخلاق اور نیک نیتی کا ثبوت خود وہی مضمون ہے جو انھوں نے اختیار کیا ہے، یعنی اس گروہ کی (جس کو خدا تعالیٰ نے مرد کے لیے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لیے مرد کا مددگار کیا ہے) تعلیم وتربیت میں کوشش کرنا درحقیقت یہ مضمون اور اس پر ان کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہوئی (گو وہ کسی طرح پر ہو) نہایت اچھی ہے، کیوں کہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی اور اگر اس میں کچھ غلطی ہے تو اس سے امید ہے کہ اوروں کو اس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی۔''

انیسویں صدی میں عورتوں کے استحصال کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہو چکا تھا، اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے پہلی بار سرسید نے اپنے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ عورتوں پر جو دھویں کے بادل چھائے ہوئے تھے انھیں ہٹانے کی کوشش کی۔ یہ کام انھوں نے اور ان کے رفقا نے ایک عرصہ تک کیا۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے قائل نہیں تھے جس ملک میں مردوں کی تعلیم ایک مسئلہ ہو وہاں عورتوں کی تعلیم پر کون کان دھرتا۔ اس لیے سرسید کارپنٹر کی نوٹ بک میں لکھتے ہیں:

''نیک کام میں کوشش کرنے والوں کی کوشش کبھی کبھی اس لیے کہ وہ ان لوگوں کی عادات، رسم و رواج کے مخالف طریقے پر جس کی بھلائی کے لیے کوشش کی جاتی ہے قائم کی گئی ہیں، برباد ہوگئی ہیں۔ حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے۔ خدا نے یوشع کے لیے سورج کا تھم جانا کہا، حالاں کہ شاید وہ غلط تھا کیوں کہ اگر وہ واقع بھی ہوا تو شاید زمین کا تھم جانا سچ ہو جاتا مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی (جو اس زمانے میں تھی) رعایت کی، پس اگر ہم کسی نیک بات کو پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑیں گے، اور خود اپنے لیے نقصان کا سبب ہوں گے۔''

اثنائے سفر میں سرسید جب مصر پہنچے تو انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ مصر میں خواتین کی تعلیم میں پیش رفت ہوئی ہے اور وہ ہندوستانی عورتوں کی طرح جہلِ مرکب میں مبتلا نہیں ہیں۔ وہ جب لندن آئے تو اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ انگلستان

میں عورتوں اور مردوں کو یکساں مواقع حاصل ہیں اور ان کے لیے مساویانہ حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جب وہ لندن سے کلفٹن گئے تو وہاں کی رصدگاہ ایک خاتون کے زیرِ نگرانی کام کر رہی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ تمام کارخانہ ایک عورت کے سپرد ہے اور جس قدر آلات کہ اب اس میں موجود ہیں اور جو عمل اس سے ہو سکتے ہیں وہ عورت کر کے دکھاتی ہے۔'' لندن میں انھوں نے خواتین کا کالجیٹ سکول بھی دیکھا۔ لکھتے ہیں کہ ''میں مدت سے اس بات کا مشتاق تھا کہ اس ملک کی عورتوں کے مدرسوں کا معائنہ کروں اور جس طریقہ میں وہاں تعلیم ہوتی ہے اس کو بخوبی دریافت کر کے اس کے نتیجے سے اپنے ہم وطنوں کو مطلع کروں۔'' ہندوستان کے قدامت پسندوں کی برہمی مول لیتے ہوئے انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں یہ بھی لکھ دیا کہ انگلستان کی خواتین کو یہ سن کر، ہندوستانی مستورات ناخواندہ ہوتی ہیں ویسا ہی صدمہ ہوگا کہ جیسے کسی ہندوستانی کو بازار میں ننگی عورت کو چلتے پھرتے دیکھ کر ہوتا۔''

۲۳؍اپریل کو جب سرسید کا جہاز سوئز پہنچا تو وہ نہر سوئز کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ابھی اس کی کھدائی جاری ہے تو انھوں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔ بعد ازاں جہاز پر ان کی ملاقات نہر سوئز کے معمار فرانسیسی انجینئر ڈی لسپس (M. de Lesseps) سے ہو گئی۔ لسپس نے ان سے کہا کہ جب وہ لندن سے واپس ہوں گے تو ان کا جہاز اس نہر کے راستے گزرے گا۔ سرسید کو ڈی لسپس کی وہ تقریر بہت پسند آئی جو اس نے جہاز کے مسافروں کو سپاس نامہ کے جواب میں کی تھی۔ سپاسنامہ میں کہا گیا تھا کہ نہایت زیبا ہے کہ اس نہر کا نام نہر لسپس رکھا جائے۔ اپنی جوابی تقریر میں اس نے کہا کہ ''میری خوشی اور میرا فخر اس میں ہے کہ یہ نہر فرنچ نہر کے نام سے منسوب کی جائے۔'' سرسید نے اس کے جذبۂ حب الوطنی کو بہت سراہا اور اس پر افسوس کیا کہ ان کے ہم وطنوں میں یہ جذبہ خال خال ہے۔

مصر میں نہروں کے جال سے اور اس کے بنانے کے فن سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ''نہر کے پاس جو اونچی زمینیں ہیں اور جن میں نہر کا پانی بہاؤ سے نہیں جا سکتا، اس کے لیے نہر کے کنارے کاٹ کا خانہ دار ایک پہیا لگایا ہے اور بذریعہ ٹٹو یا بویا بیل کے ذریعہ بخوبی کھیتوں میں پانی پہنچتا ہے۔ اگر اس پہیے کو ہمارے ملک میں رواج دیا جائے تو بلاشبہ فائدہ مند ہوگا۔''

سرسید نے مصر میں بازار سوئز کی بھی سیر کی، وہ لکھتے ہیں کہ ''ہم نے بازار کے لوگوں سے جو عربی بولتے تھے دیر تک باتیں کیں۔'' سرسید کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی عربی کی استعداد واجبی تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو اہل زبان سے دیر تک عربی میں گفتگو پر قادر نہ ہوتے۔ عربی زبان پر ان کے عبور کا کچھ اندازہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں ابو حامد الغزالی (جن کے رسالے کیمیائے سعادت کی کچھ فصلوں کا ترجمہ ۱۸۵۳ء میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی فرمائش پر سرسید نے کیا تھا) کی تصنیف القسطاس المستقیم کے مخطوطہ پر عربی زبان میں ان کے عالمانہ حاشیوں سے ہو سکتا ہے۔ دراصل سرسید کے خلاف ان کے قیام لندن کے دوران کوا گہار شروع ہوئی جس کا شور اتنا بڑھا کہ اس میں ان کی بہت سی خوبیاں اور ان کے اعمال و افکار کے بہت سے حیات بخش پہلو دب کر رہ گئے۔ ان میں عربی زبان پر ان کی اچھی دسترس بھی ہے۔

سرسید کا جہاز جب مصر سے اٹلی پہنچا اور بونی فیشیو سے گزرا تو وہ جزیرہ کیپریا اور کارسکا کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گئے جو ممتاز محبِ وطن گیری بالڈی اور نپولین بونا پارٹ کی جائے پیدائش ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''مجھ کو کمال آرزو تھی کہ میں اس زمانے کے سب

سے بڑے فیاض، دلاور گیری بالڈی کے پھونس کے جھونپڑے کی جو بڑے بڑے قیصروں کے محلوں سے بھی زیادہ معزز اور قابلِ ادب و تعظیم ہے زیارت کروں۔"

جب ان کا جہاز مارسیلز پہنچا تو رات ہو چکی تھی، انھوں نے ہوٹل جاتے ہوئے راستے میں شہر دیکھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ رات کا وقت تھا اور یہ پہلا یورپ کا شہر ہے جس کو ہم نے دیکھا جب ان کی اومنی بس بازار میں پہنچی تو دیوانوں کی طرح وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ لکھتے ہیں کہ "کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی شیشۂ آلات میں ہم نے کبھی دیکھی نہ تھی۔"

یکم مئی کو وہ شہر مارسیلز سے روانہ ہوئے اور ٹرین نہایت نرمی اور سکی سے روانہ ہوئی اور میدان اور کھیت اور گاؤں ان کی نظر سے گزرتے رہے لیکن ان کے دل میں بار بار اپنے ملک کا خیال آیا کبھی فرخ آباد اور میرٹھ کے آلو اور کبھی غازی پور کے گلاب کے تختوں کی یاد آئی۔ انھوں نے لکھا کہ "یہاں قدرت کی خوبی اور خوب صورتی اور انسان کی کاریگری اور عقل مندی نے مل کر عجیب ہی کیفیت دکھلائی تھی۔"

دوسری مئی کو وہ پیرس پہنچے وہاں جھیلوں چشموں اور نہروں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے لیکن وہ وہاں کی عمارتوں سے متاثر نہ ہوئے، لکھتے ہیں کہ "بایں ہمہ صرف عمارت جیسی عمدہ اور مستحکم اور نہایت ہی خوب ہمارے ملکوں کی ہے اب تک یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ بلاشبہ تاج محل کے روضے اور قطب صاحب کی لاٹھ سے ہندوستان کی عمارت کو فخر ہے۔ انھیں یہاں لال قلعہ دہلی اور اس کی مارپیچ نہر جو دیوانِ خاص میں ہو کر رنگ محل میں جاتی تھی اور جس کے پانی سے وہ بھی بچپن میں کھیلا کرتے تھے اور مہتاب باغ کا حوض یاد آیا جس کے کناروں سے تین سو ساٹھ فوارے چھوٹا کرتے تھے۔ لیکن وہ وارسائی (Versailles) کے نگارخانوں سے بہت متاثر ہوئے۔ لکھتے ہیں کہ "تصویر خانہ نہیں ہے بلکہ قومی ہمت اور قومی جرأت اور قومی شجاعت بڑھانے کا آلہ ہے۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ تمام قوم فرنچ کی جب ان تصویروں کو دیکھتی ہوگی اور اپنے بزرگوں کی بہادری اور شجاعت اور میدانِ جنگ میں مرنا اور اپنے تن بدن کو زخموں سے چور کرنا اور مرنا یا مارنا خیال کرتی ہوگی اس کی ہمت اور شجاعت دگنی ہو جاتی ہوگی اور چلوؤں خون بڑھ جاتا ہوگا۔" لیکن وہ اس تصویر کو دیکھ کر بہت بدمزہ ہوئے جس میں الجزائر کے مجاہدِ آزادی امام عبدالقادر اور ان کے اہلِ خانہ کی گرفتاری کا منظر دکھایا گیا ہے۔ اس کی عورتیں اونٹ پر کجاوے میں تھیں۔ فرنچ سپاہیوں نے اونٹ کو بٹھا کر کجاوہ گرا دیا ہے اور عورتیں اس میں سے نکل پڑی ہیں اور ان کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے اور فرنچ سپاہی سنگین اٹھائے ہوئے اور ان کی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے گویا اب ماریں گے ان کے گرد کھڑے ہوئے ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ کیا فرنچ کو یہ زیبا تھا، پھر انھوں نے ان الفاظ میں امام عبدالقادر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ "امام عبدالقادر سچا بہادر سپاہی ہے جب کہ وہ الجزائر کا بادشاہ تھا اور جو عزت کہ اس وقت لوگوں کی آنکھ میں اس کی تھی اب بھی اس میں کچھ کمی نہیں ہے۔ نہایت بہادری اور سچائی سے بغیر دغا فریب کے بیس برس تک تن تنہا لڑتا رہا، انجام کو شکست ہوئی جس سے کچھ اس کی سپہ گری یا عزت میں فرق نہیں آیا۔ پس ایسی تصویریں بنانے سے بہ عوض اس کے کہ اس کی حقارت ہو، اس کی جرأت اور شجاعت ثابت ہوتی ہے۔" یہ بات توجہ طلب ہے، سرسید ان تمام رہنماؤں سے گہری ہمدردی رکھتے ہیں جو اپنے ملک کی جدوجہدِ آزادی میں سرگرم ہوں۔ چاہے وہ اٹلی کے گیری بالڈی ہوں یا الجزائر کے امام عبدالقادر، یا آئرلینڈ کے مجاہدینِ آزادی۔

۴ مئی ۱۸۶۹ء کو سرسید لندن پہنچے وہ وہاں میکلن برگ سکوائر میں مقیم ہوئے۔انھوں نے یہاں علمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، وہ اس جلسے میں موجود تھے جب چارلس ڈکنس نے آخری بار اپنی تصانیف کی بلند خوانی کی۔وہ کارلائل سے بھی ملے اور اس کی تصنیف ''ہیرو اور ہیرو ورشپ'' کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔سرسید کی معرکۃ الآرا تصنیف آثار الصنادید کی وجہ سے فرانس اور انگلستان کے علمی حلقوں میں ان کا چرچا پہلے ہی سے تھا۔یہاں بہت سی ممتاز شخصیتوں نے ان کا استقبال کیا، انھیں متعدد جلسوں اور شاہی تقریبوں میں مدعو کیا گیا۔اگست ۱۸۶۹ء میں انھیں سی ایس آئی کا خطاب دیا گیا۔۴ر اگست ۱۸۶۹ء کو اتھینیم کلب (Athenaeum Club) نے انھیں اپنی اعزازی رکنیت پیش کی۔یہ ایک مخصوص قسم کا کلب تھا جس میں انتہائی مشہور و معروف شخصیتوں میں سے صرف بارہ سو کو اس کا ممبر بننے کی اجازت تھی، جس وقت سرسید کو اس کا رکن بنایا گیا تھا تین ہزار اشخاص کئی برسوں سے اس کے ممبر بننے کے امیدوار تھے۔سرسید کو انگلستان میں جتنے اعزازات ملے ان میں وہ اس کلب کی رکنیت کو اعلیٰ ترین اعزاز تصور کرتے تھے۔اس کلب کا حال بیان کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں: ''ہم نے علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اس کے لیے ایسا عمدہ اور عالی شان مکان بنایا جو اس وقت تک ہندوستان کے ہندوستانی مجمعوں کے لیے نہیں بنا ہے، پھر اس سے کیا نتیجہ ہے ہم وہ آدمی کہاں سے لائیں جو لکچروں میں شریک ہوں اور اس عالی شان مکان کو رونق دیں۔ہم وہ آدمی کہاں سے لائیں جو لکچروں کے سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہوں۔ہم وہ آدمی کہاں سے لائیں جو اپنے ملک اور اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کچھ محنت اختیار کریں اس کو جانے دو ہم کو تو ایسے دو چار آدمی بھی نہیں ملتے جو اس مکان میں بیٹھ کر اگر کچھ نہ کریں تو اپنی قوم کی ابتر حالت پر روویں ہی۔''

سرسید ہندوستانیوں کے لیے بہترین قسم کی عصری تعلیم چاہتے تھے وہ ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو ہندوستانیوں کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل کردے۔کیمبرج یونیورسٹی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''کیمبرج کی یونیورسٹی کی سیر سے جو اس قدر دانش مندی اور فیاضی اور جاں فشانی اور محنت کے ثبوت میری نظر سے گزرے ان کے دیکھنے سے مجھ کو نہایت حیرت ہوئی اور میں نے اپنے دل میں بہ آرزوئے تمام یہ دعا مانگی کہ میرے وطن ہندوستان میں جو ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں میں ہنوز ہمسری اور ترقی کا جوش نہیں ہے وہ بہت جلد برانگیختہ ہوتا کہ اس کو بھی آیندہ کسی زمانے میں جو نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہنوز بہت دور ہے۔علوم و فنون میں مشرقی ملکوں میں ایسی ہی شہرت اور عظمت حاصل ہو جیسی کہ انگلستان کو مغربی ملکوں میں حاصل ہے۔''اس سفرنامہ میں جگہ جگہ شرقیت کے وہ عناصر پھیلے ہوئے ہیں جو بعد میں اقبال کے یہاں واضح طور پر سامنے آئے۔

سرسید کا سفرِ انگلستان ان کے تعلیمی افکار کی تشکیل میں بڑا اہم ثابت ہوا۔لندن کا لبرل ماحول، وہاں کی تعلیمی فضا کا اثر یہ ہوا کہ لندن میں ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام تعلیم پر انھوں نے ایک رسالہ Structures Upon Present Indian Educational System کے عنوان سے لکھا جس میں ہندوستان کے موجودہ سررشتۂ تعلیم کی نسبت سخت تنقید کی گئی ہے اور اسے ناقص بتایا گیا ہے۔

اپنے لندن کے قیام کے دوران انھوں نے ایک اور اہم کام کیا۔سر ولیم میور جو صوبہ شمال و مغرب کے گورنر تھے انھوں نے لائف آف محمد کے نام سے چار جلدوں میں کتاب لکھی جس میں انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر کڑی تنقید کی۔جب سرسید ہندوستان

میں تھے وہ اسی وقت اس کے تردیدی جواب کے لیے بے چین تھے، لیکن اس کے لیے وہ جن کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے وہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں انگلستان پہنچ چکی تھیں۔ اقبال نے اسی لیے کہا تھا کہ کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھوں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ۔ اس لیے جب سرسید انگلستان پہنچے تو لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کی کتابیں دیکھنے کی سہولت وہاں انھیں حاصل ہوئی۔ سرسید نے نہ صرف یہ کہ کتاب لکھی بلکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی کرایا اور لندن سے اپنی ہندوستان روانگی سے قبل شائع بھی کروا دیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا خیال ہے کہ ''انگلستان کے سفر سے جو فائدے سرسید نے اٹھائے ان سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو خطبات احمدیہ کا ترجمہ انگریزی زبان میں چھپوانا اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ صرف اس کی بنا پر اس سفر کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ لندن کے زمانۂ قیام میں سرسید نے خود اپنے قلم سے مذہب اسلام کی خدمت کرنے کے علاوہ ایک عیسائی جان ڈیون پورٹ (John Davenport) کی کتاب اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن کو جس میں اسلام کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں اپنے خرچ پر چھپوایا اور اسی قسم کی ایک کتاب جو گاڈفرے ہگنز (Godfrey Higgins) نے لکھی تھی حاصل کی اور ہندوستان آنے کے بعد اس کا ترجمہ حمایت الاسلام کے نام سے شائع کروایا۔

یہ سفرنامہ سرسید کے اسلوب بیان کا شاہکار ہے اس میں جو منظر نگاری کی گئی ہے وہ بھرپور ہے۔ وہ واقعہ کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کیا دیکھا اور اس دوران ان کے دل و دماغ پر کیا بیتی۔ اس سفرنامہ میں نیم ڈرامائی اور قارئین سے براہ راست گفتگو کا انداز نمایاں ہے۔ اس میں جو تشبیہات آئی ہیں وہ بے ساختہ، بہت صاف اور واضح ہیں۔ میرے نزدیک سرسید کو لفظی تصویر کشی میں خداداد ملکہ حاصل ہے۔ اس سفرنامہ میں اشیاء اور افراد کے کئی بے لاگ خاکے ایسے ہیں جن کو مغلوں کی مینا تور مصوری کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایک انگریزی اخبار سینٹ جیمس بجٹ نے مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کے شمارہ میں اس سفرنامہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سفرنامہ کا خوابناک انداز ہمیں چند بہترین سفرناموں کی یاد دلاتا ہے اس نے اس کا موازنہ تزک بابری سے کیا ہے۔

تہذیبی خلا کا تخلیقی اظہار

(''الواح'' از ڈاکٹر وحید قریشی)

سفیر حیدر

شب تاریک، آندھیاں، نوحے

یوں لگا، جیسے مر گیا ہوں میں

ڈاکٹر وحید قریشی کی رحلت کے منظر پر انہی کے درج بالا شعر پر اکتفا کروں گا۔ کیوں کہ ان کی ادبی زندگی کی مسافت اتنی بھرپور اور طویل ہے کہ ہر بڑے معاصر قلم کار سے کسی نہ کسی سطح پر وہ رابطے میں تھے۔ یوں ان کے ساتھ جن اصحاب کا زیادہ وقت گزرا ہے وہ ان کی یادوں کو بہتر طور پر تازہ کر سکتے ہیں۔ میری ان سے صرف ایک بھرپور ملاقات ہے لیکن یہ ایک ملاقات وہی میر والی ملاقات ہے جو عمر بھر چلتی ہے۔ اس ملاقات کا شرف ''مخزن'' کی وجہ سے حاصل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے مضامین کے حوالے سے یاد فرمایا اور پذیرائی بخشی۔ میرے لیے ان کی حوصلہ افزائی کے الفاظ میری استطاعت، صلاحیت اور ظرف سے زیادہ تھے اور میں کئی دن پھولے نہیں سمایا اور اب بھی جب کبھی شاید احساس کمتری کا شکار ہوتا ہوں، اپنی نیم بنجر ذہنی صلاحیتوں سے گھبرا جاتا ہوں، ادھر اُدھر سے حوالوں کے ڈھیر اکٹھے کرنے کے بعد بھی دو سطریں نہیں لکھ پاتا اور جب کبھی دو چار صفحے لکھ لیتا ہوں اور دوبارہ ان پر نظر ڈالتا ہوں تو بقول شخصے صورتِ حال ایسی ہوتی ہے کہ لکھی ہوئی عبارت شاندار بھی ہوتی ہے اور اوریجنل بھی لیکن جہاں شاندار ہوتی ہے وہاں اوریجنل نہیں اور جہاں اوریجنل ہوتی ہے وہاں شاندار نہیں۔ ایسی بے ثمر صورت حال میں بھی اس ملاقات سے ایک فیض کا چشمہ جاری ہوتا ہے۔ مسافر کو اس طور سیراب کرتا ہے کہ پسپائی کا ارادہ پسپا ہو جاتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک تو ڈاکٹر صاحب سے ایک ملاقات ہے اور دوسری ''الواح''۔ آل مختصر اس کتاب کی شاعری میں مرحوم کی شخصیت کی تجسیم بھی بڑی واضح ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بطور محقق، نقاد اور استاد تو زیادہ یاد کیا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری کے قریب جائیں تو ژیٹس کے الفاظ میں یہ صورت حال نظر آتی ہے۔

"I brought to such a pitch my thought."

یہ "Pitch" اور شعور کی پختگی شاعر کو من و سلویٰ کی صورت نہیں ملی بلکہ اس کے پیچھے طویل مسافتوں اور ریاضتوں کی تھکن ہے۔ نروان کی دلھن اپنی ذات کی چار دیواری سے پار جھانکنے کے بعد اپنا گھونگٹ اٹھاتی ہے۔

بھٹکا ہوا ایک قافلہ ہوں
اور دشتِ وفا میں پھر آ رہا ہوں
میں تیرے عذاب جانتا ہوں
میں درد کی آگ میں جلا ہوں

اس درد کی آگ کا پھیلاؤ دوطرفہ ہے،ایک شعلہ ظاہری معاشرتی زندگی کے رکھ رکھاؤ اور اقدار کے ہرے بھرے شجر کو جلا کر راکھ کرتا ہے تو دوسرا شعلۂ ذات کے اندر پڑے قیمتی سامان کی طرف لپکتا ہے۔آج کا انسان ایسی رہزنی کی زد میں ہے جہاں خیمہ ذات کو چاروں اطراف سے آگ دکھائی جاتی ہے تو من سوزم،'من سوزم' کی چیخ پکار اٹھتی ہے اور اگر آدمی کچھ بچا کر اس جلتے خیمے سے نکل بھی پڑے تو سامنے کھڑے رہزن کے پیروں میں منہ کے بل گر پڑتا ہے۔آج کا انسان اپنی ذات اور شناخت سے علیحدگی کی صورت میں خسارے میں ہے۔اس خسارے کے منظر نامہ کو"الواح"میں پکچرائز کیا گیا ہے۔جو ایک تنبیہہ بھی ہے۔

میں ذات سے اپنی کٹ گیا ہوں
اک لاش پڑی ہے دیکھتا ہوں
گاؤں سے چلا تھا بچ بچا کر
اور شہر میں آ کے لُٹ گیا ہوں

نگری نگری پھرنے والا مسافر جب گھر کا راستہ بھول جاتا ہے تو اپنے پرائے کی شناخت بھی کھو دیتا ہے۔گاؤں (اپنے اصل تہذیبی اثاثے) کو چھوڑ کر شہر (بغیر تجزیاتی محاکمے کے دوسری دنیا کی روش) کو اپنانے سے نہ صرف فرد خود سے کٹ جاتا ہے بلکہ پوری نسل کی نسل بے جڑ ہو جاتی ہے پھر کھلتا ہے کہ:

"اور شہر میں آ کے لُٹ گیا ہوں"

یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ"الواح"کا مرکزی خیال"تشخص کی تلاش"ہے۔

چاروں اور گھنی تاریکی
ناچ رہے ہیں کالے ناگ
اب جاؤں تو کس نگری میں
کون سی بستی نور
پاؤں کی زنجیر بنا ہے دھرتی کا منشور
میں غم دیدہ میں رنجور
اپنے آپ سے دور کتنا چھٹا دستور

یہ مابعدالطبیعاتی بے وطنی "Metaphisical Homelessness" اندھی تقلید کی کوکھ سے جنم لے رہی ہے ایک

نا دیدہ خلاء میں گرا ہوا آدمی دوستوائفسکی کے الفاظ میں کچھ ایسی صورت حال سے دوچار ہے۔

''الواح' میں یہ انفرادی خلاء ''Everything around me has become could and empty......''
ایک تہذیبی خلاء کا بھی پیش خیمہ ہے، جہاں رشتوں اور اقدار کی موت نے ایک لامحدود خالی پن کو جنم دے دیا ہے۔صرف ایک مثال ملاحظہ کیجیے، جو شاعر کے ذاتی تجربے کی تلخی سے بھی عبارت ہے اور معاشرے میں پھیلی بغض اور حسد کی زہرناکی بھی عیاں ہے۔ جہاں پستہ قد لوگ بڑے دروازے سے گزر کر جھوٹی عظمت کے متلاشی، دم توڑتی تہذیب میں بونے قد آوروں سے الجھ کر بلند قامتی کے خواہش مند ہیں۔

نیش زن شاگرد اور حیران میں
سانپ میری گود میں کیا کیا پلے

''الواح'' کی کہانی میں بے سمتی کا یہ منظر بھی ہے اور اس کا سبب بھی واضح ہے کہ راستہ دکھانے والے ستارے خود نابینا ہیں۔

دوروں عقل دے کھم سیہاپن — میرے ملک دے وڈے لوک
جاں میں نیڑے ہو کے ڈٹھا — شاہ دولہ دے چوہے لوک

ایسے بانجھ منظرنامے کو سرسبز و شاداب کرنے کے لیے ایک ایسی گھٹا کی ضرورت ہے جو چاروں طرف سے گھر کر آئے، شاید پھر بے انت گہرائی تک بنجر ہو جانے والی تہذیبی اور ثقافتی زمین کی گود ہری ہو سکے۔

سب دشت و دریا
پھیلے کے پھیلے
میلے کے میلے
بادل کا ٹکڑا
کس کس پہ برسے
نکلا ہے گھر سے

یہاں ''الواح'' کا ایک پہلو زیر بحث لایا گیا ہے جو تہذیبی تنہائی سے عبارت ہے ورنہ اس مختصر شعری مجموعے میں زمان و مکان سے لے کر جمالیات تک کئی موضوعات کو تخلیقی جوہر کی کیمیاگری کا مظہر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

فضا درد کی راگنی گا رہی ہے
ازل سے ابد تک یہی داستاں
وقت ریگِ رواں

مضمون کا مجموعی تاثر معاصر صورت حال سے پیدا شدہ اعصابی تناؤ کے زیر اثر یاس انگیز ہو گیا ہے، لیکن ''الواح'' میں روشنی کی نوید بڑے واشگاف لہجے میں سنائی گئی ہے۔اور گوئٹے کے آخری الفاظ:

Open the second sutter so that more light may come

والا زندگی کا اثبات یہاں بھی واضح ہے۔

اب راتوں کی تیرگی چھٹے گی
اب درد کی گرد بھی ہٹے گی

امید بہار آرزو ہے
پھولوں کی تلاش و جستجو ہے

یوں عارف عبدالمتین کی رائے میں ''ہم 'الواح' کو کمیت کے لحاظ سے مختصر مگر کیفیت کے اعتبار سے نہایت جامع شعری صحیفہ قرار دے سکتے ہیں۔'' اور حیران کن حد تک اختصار کے ساتھ جامع تخلیقی اظہار کی معجز نمائی اور مضمون کی تہذیبی جہت کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔

''ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری آسمان شعر پر ایک ایسی قدرتی دھنک کے متماثل ہے جس میں روح، وطن، ملت، انفس، آفاق، جمال اور استمرار کو ان سات رنگوں کا اعزاز حاصل ہے جن سے یہ نظر افروز دھنک متشکل ہوئی ہے۔روح اس معتقداتی اساس کا تعین کرتی ہے، جسے توحید و رسالت سے استحکام میسر آتا ہے اور جو کتاب کے نام 'الواح' کی وساطت سے بھی اپنے وجود کلیمی کا ادراک بخشتی ہے۔وطن کا حوالہ پاکستان کی سونی دھرتی کو اس کی تمام تر ارضی دلکشیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ملت امت مسلمہ کو اس کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں ہمارے روبرو لانے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔''

دشت سوس، ''فنا سے بقا تک''

مشتاق احمد بیگ

جمیلہ ہاشمی کا ناول ''دشتِ سوس'' تاریخی استدلال، عشقِ بے مثال اور تصور ''فنا و بقا'' کی ایسی رنگا رنگ تکون سے وجود میں آیا ہے، جس کے تمام تر عناصر ہمیں اپنی صحیح اور مکمل حالت میں نظر آتے ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے قرب کی جستجو اور اُسے پا لینے کی خواہش روزِ اول سے انسانی زندگی کا مقصدِ حیات رہا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی تلاش میں سرگرداں انسانوں کو کبھی تو کوہِ طور پر اپنے نور کی تجلیوں سے نوازتا اور کبھی چپکے سے عرشِ معلّٰی پر بلا کر اپنے دیدار سے سرفراز کرتا ہے۔ ''دشتِ سوس'' کا مرکزی کردار حسین بن منصور حلاج ایسا ہی ایک کردار ہے جو اپنے جنون اور عشق کے سہارے فنا سے بقا تک کے تمام فاصلے ایک ہی جست میں طے کر لینے کا آرزو مند ہے۔ وہ جو حقیقت میں عارف باللہ ہے اُسے خود تماشا بننے اور اپنی محبت کو تماشا بنانے میں ایک طرح کی عجیب سی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اہلِ زیست سے قطع تعلق اور طبیعت کی جذب و مستی اُس کے وجود کے قطرہ آب کو اس قدر بے قرار کیے رکھتی ہے کہ وہ سمندر کے مقابل سر بکف نظر آتا ہے اور اپنی حد سے بڑھی ہوئی دیوانگی میں اُن مخفی رازوں سے حجاب اُٹھانے کا شوقین ہے جن کا انجام صرف اور صرف موت ہے۔

صاحبِ کشف المحجوب حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ تصورِ فنا و بقا کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''جس شخص کو مقامِ فنا حاصل ہوتا ہے وہ اپنے آپ سے فانی ہو جاتا ہے (یعنی اپنی ہستی کو ذاتِ حق میں گم کر دیتا ہے) اس کے بعد جب وہ مقام فنا فی اللہ سے مقام بقا باللہ پر آتا ہے تو اپنی ہستی سے باقی ہوتا ہے یعنی اپنی انسانی ہستی میں واپس آتا ہے ...... جب کوئی کہتا ہے کہ مجھے فنا حاصل ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے وجود کا اثر کم ہو گیا ہے نہ کہ وجود بالکل فنا ہو گیا ہے کیوں کہ جب تک اپنے وجود یا اپنی ہستی کا احساس موجود ہے فنا مکمل نہیں ہوئی اور جب فنا میسر آ گئی تو پھر فنا کا فنا ہونا کیا ہے؟''[1]

جب کہ ابو بکر شبلی کے نزدیک:

> ''فقر بحرِ بلا ہے اور دوست کی فرستادہ بلا عزت ہے۔''[2]

مگر حسین بن منصور حلاج کے ہاں ماجرا کچھ اور ہے۔ اس کے نزدیک ''صحو'' اور ''سکر'' دونوں بندہ کی صفات ہیں۔ جب تک اس کی یہ صفات فنا نہیں ہوتیں، انسان حق تعالیٰ سے محجوب رہتا ہے۔ وہ نہ تو فنا کا طالب ہے اور نہ ہی بقا پر مطمئن، بلکہ وہ

ان دونوں حالتوں سے ورائی منزلوں کی تمنا کے پُرخطر راستوں پر گامزن ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ کر گزرنے کا متمنی اور ''انا الحق'' کا دعویٰ دار ہے۔

حسین بن منصور کے انھی نظریات کے پیش نظر جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناول ''دشتِ سوس'' میں جہاں اُس کے لافانی کردار کا جائزہ لیا ہے، وہاں ناول کی تہہ میں چھپے عصرِ حاضر کے روحانی انحطاط و زوال کو تاریخی استدلال کی روشنی میں جانچا ہے اور اپنی فلسفیانہ حکمت سے موجودہ مشینی دور کے مادیت پرست اصحابِ فکر و دانش کو روایت سے جڑے رہنے کی ترغیب دی ہے۔

بلاشبہ ان کا ناول ''دشتِ سوس'' تاریخی موشگافیوں کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی اور تصورِ فنا و بقا کی ایسی رنگا رنگ کیفیت سے وجود میں آیا کہ جس کے تمام تر مظاہر ہمیں اپنی صحیح اور مکمل حالت میں نظر آتے ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ عرفانِ ذات کی جستجو اور عشقِ حقیقی کی تمنا نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کا مقصدِ اولین رہ چکا ہے بلکہ ہر دور کا انسان اس منزل پر کامیابی سے پہنچنے کے لیے مختلف قسم کی چارہ جوئی میں بھی مصروف نظر آتا ہے لیکن موجودہ مادیت پرستی نے جہاں اخلاقی قدروں کو تہہ بالا کر رکھا ہے وہاں انسان، انسان سے ڈرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی خوفزدہ ہے، ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کی روحانی و اخلاقی اقدار کی ازسرِ نو تشکیل کرتے ہوئے فکری بے سمتی پر قابو پایا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو تہذیب و تمدن کی پامالی اور انسانیت کی ذلت آمیز شکست ہمارا مقدر ہو گی۔ جس کا صریحاً مطلب یہ ہو گا کہ انسان نہ صرف اپنے منصبِ حقیقی سے دستبردار ہو چکا ہے، بلکہ شر کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسروں کو ایذا پہنچانے کی ایسی ڈگر پر چل نکلا ہے جہاں فنا کے، فنا سے زیادہ کچھ بھی معنی نہیں ہیں اور ابدیت و بقا کی انسانی خواہش محض ایک واہمہ بن کر رہ گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے ''دشتِ سوس'' میں انسان کی تخلیق، اس کی ذہنی و فکری نشو و نما، اس کے تصورِ فنا و بقا، تہذیب و تمدن سے اُس کے فرار اور تصوف و مذہب کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے متعلق بحث کی ہے۔ انھوں نے ناول کے مرکزی کردار حسین بن منصور کے عشق اور ''فنا سے بقا تک'' اس کے سفر کو انسانی عظمت کا منبع قرار دیتے ہوئے، ان تلخ حقایق کی بھی نشان دہی کی ہے، جن کا سامنا اس راہِ دشوار میں قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ناول میں تہذیب و تمدن کی شکست و ریخت، روحانی و اخلاقی اقدار کی پامالی، مایوسی، خوف اور فتنہ و فساد کو تاریخی تسلسل میں کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ عصرِ حاضر کا قاری خود کو اس بے اماں دور کا فرد محسوس کرنے لگتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ لوگوں کے بدلتے ہوئے عقاید، اسلامی سلطنت کی زبوں حالی، قحط الرجال اور مسلمانوں کی حالتِ زار ناول کو موجودہ دور سے اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ یہ آج کے دور کا پُرآشوب نوحہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر حسین بن منصور کی شوریدہ سری ہو یا اغول کی یک طرفہ محبت، ابوبکر شبلیؒ کی وارفتگی ہو یا جنید بغدادیؒ کی مصلحت پسندی، آقائے رازی کی فلسفہ طرازی ہو کہ حامد بن عباس کا بغض و عناد، ناول میں تمام کرداروں کا تانا بانا، عشقِ حقیقی اور تصورِ فنا و بقا سے جڑا نظر آتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول ان کی نظریاتی کمٹ میںٹ سے کہیں بڑا دکھائی دیتا ہے اور روحانی قدروں پر ان کا اعتقاد پختہ تر معلوم ہوتا ہے۔ ناول کی بنیادوں میں علمِ تصوف کی گہرائی، گم شدہ ماضی کی کسک، حال کی ابتری، حسن کی بے نیازی، اپنوں کی بے بسی، اقتدار کی سرکشی، عشق کی بے نیازی، روح کی بےقراری، وحدت الوجودی فلاسفی، مذہب کی پاسداری اور ذات کی خودسری

اپنے کلی وجود کے ساتھ اس طرح جلوہ افروز ہے جیسے کسی ویران سرائے میں پل بھر کے لیے مسرتوں کی قندیلیں روشن ہو جائیں، رقص و سرور کی محفلیں سجائی جائیں، طعام و قیام کے بندوبست کیے جائیں اور پھر اگلے ہی لمحے اُن درماندہ مسافروں کے لیے کوچ کا نقارہ بجا دیا جائے۔ ایک حسرتِ ناتمام کی سی کیفیت، سحر سے کچھ دیر پہلے کے بجھے ہوئے چراغ، جیسے ابھی سب کچھ تھا اور اب کچھ بھی نہیں، اگر کچھ ہے بھی تو "دشتِ سوس" کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی دھول۔ ایسے میں ایک عام قاری سوائے آنکھیں ملنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے اور پھر اس ناول کی تہہ تک رسائی اس کا مقدر کیسے بن سکتی ہے۔ جو حقیقت و معرفت کی باریک بینیوں اور روحانیت کے پرفریب راستوں سے آشنا ہی نہیں۔ ناول کا مرکزی کردار حسین بن منصور حلاج جو اوائل عمری ہی سے کسی ماورائی قوت کا اسیر ہے۔ اپنے گرد و پیش کی بے ثباتی اور کسبِ علم و ہنر کی بے قراری سے مجبور ہو کر اپنے باپ منصور کے ہمراہ ماتھے پر داغِ دلربائی سجائے سہل بن عبداللہ تُستری کے حضور پہنچا تو اُسے ان کے دروس میں شرکت کا پروانہ مل گیا۔ اُس کا باپ منصور مطمئن تھا جیسے کسی بارِ گراں سے سبک دوش ہو گیا ہو لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ حسین جس کے ماتھے پر داغِ دلربائی سجا ہے، سہل تُستری کے اُن رسائل کا مطالعہ کرنے لگا ہے جنھیں وہ اپنے طالب علموں سے چھپائے رکھتے ہیں اور جب انھیں معلوم ہوا کہ حسین رسائل کے سبق جو ابھی اس کے فہم و ادراک سے پرے ہیں، کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو انھوں نے اُسے اپنے پاس طلب کیا۔ حسین سر جھکائے اُن کے حضور پیش ہوا۔

"تمھیں معلوم ہے تمھاری طلبی کیوں ہوئی ہے؟" انھوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔

اس نے گردن جھکالی،

"بیٹھ جاؤ۔" انھوں نے ہاتھ سے اپنے سامنے کی زمین کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا حسین؟" "یہ سب رسالے ابھی تمھاری فہم و ادراک سے پرے ہیں، یہ تمھارے لیے نہیں۔"

"جی" ۔اس نے کہا، مگر میں انھیں سمجھنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔"

"جاؤ۔" شیخ نے کہا۔

"ہر شے کا وقت متعین ہے ازل سے جو مقدرات قائم ہو چکے ہیں۔ ان پر خوش رہو۔" [۲۲]

حسین کو شیخ سے اجازت تو مل گئی تھی مگر مجوسی خون آمادۂ بغاوت تھا۔ وہ تُستر سے بصرہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُسے رودِ کارون کے ساتھ شاہراہ پر نسطوری عیسائیوں کے ساتھ سفر کی اجازت مل گئی مگر یہ سفر حسین کی زندگی کا ایک ایسا سفر ثابت ہوا جس کی کسک اُسے تمام عمر محسوس کرنا تھی۔ اغول سے اُس کی پہلی ملاقات اسی سفر میں ہوئی۔ سنہری بالوں اور خوبصورت آنکھوں والی یہ عیسائی لڑکی جو کنیزوں کے سوداگروں کے ہاتھ بک کر کسی محل کی زینت بننے والی تھی، حسین کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں حسین کا تعاقب کرنے لگیں۔ وہ اُسے فرشتوں کے جھنڈ میں مسیحا کے روپ میں اپنے کمرے میں دیکھ کر ابنِ مریم سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ حسین کے ذکر سے فنا ہو کر بقا کی ابدی زندگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور حسین اپنی تلاش میں سرگرداں دربدر کی خاک چھاننے میں مصروف تھا۔

تُستر سے بصرہ تک کا اُس کا یہ سفر اُس کی زندگی کی یادگار بن گیا۔ اُسے اگرچہ اغول سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر پھر بھی وہ اپنے

اندر ایک عجیب سی کسک محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی عزیز ترین شے کو گم کر بیٹھا ہے اور اغول کی نگاہیں ہمیشہ کے لیے اُس کی نگہبان مقرر ہو چکی ہوں اور وہ اُن کے تعاقب سے بچنے کے لیے درماندہ مسافروں کی طرح زندگی کا بوجھ اُٹھائے اپنی متاعِ حیات کو لٹاتا چلا گیا۔ اُس پر عجیب دیوانگی مسلط تھی۔ اُس کی یہی دیوانگی اُسے عشقِ مجاز سے عشقِ حقیقی اور فنا سے بقا تک لیے بھاگتی رہی مگر وہ کسی بھی حال میں مطمئن نہیں تھا۔ وہ تو آگے سے آگے بڑھنے کا خواہاں تھا۔ بغداد پہنچ کر عمر بن عثمان مکی کے دروس میں شرکت کا طلبگار تھا۔ جنھوں نے دروس میں شرکت کی اجازت تو دی مگر اُسے اپنے سلسلے میں لینے سے انکار کر دیا۔ وہاں اُس نے ''تنج نامہ'' کا مطالعہ شروع کیا جسے عمر بن عثمان مکی نے اپنے شاگردوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ عمر بن عثمان مکی کے دروس سے مراجعت اختیار کرنے کے بعد وہ جنید بغدادیؒ کے پاس حاضر ہوا۔ جنھوں نے اُسے واپس تُستر بھیج دیا۔ جہاں وہ روئی دُھننے کے ساتھ ساتھ سہل بن عبداللہ تُستری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا مگر زیادہ دیر تک نہیں، اُس کی بے قراری میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ حسین جو عشقِ حقیقی کی لذت سے آشنا ہونے کا خواہش مند تھا، اپنی راہ میں حائل تمام فاصلوں کو جلد سے جلد طے کرنا چاہتا تھا مگر اپنے مقدر سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ تُستر سے حسین مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں قرمطی باغیوں نے قافلے والوں کو تہ تیغ کر دیا اور اُسے تن تنہا چھوڑ دیا تا کہ وہ لوگوں کو قرمطی باغیوں کے عزائم سے آگاہ کر سکے۔ حرمِ کعبہ میں وہ رقصاں درویشوں کے حلقے کے قریب ستون سے ٹیک لگائے، خلقت کے لیے دعاؤں میں مشغول تھا کہ اُس کے مریدِ خاص زرگر نے اُسے اغول کے لیے دعا کی درخواست کی۔ اغول کا نام سنتے ہی حسین پر غشی طاری ہو گئی اور اغول غور سے اُس کے چہرے کو تکتی رہی۔ جیسے پہچان رہی ہو کہ یہ تو وہی حسین ہے جس کی پل بھر کی رفاقت نے اُس کا قرار لوٹ لیا ہے۔

اغول کی محبت نے حسین کو پھر اپنے میں مشغول کر لیا۔ اس تشنہ جان، سوختہ قلب کو صرف اغول کی آرزو تھی۔ وہ گلیوں میں دیوانہ وار اغول کو تلاش کر رہا تھا۔ اغول جس کی ذات سے اُس کی فنا منسوب تھی۔ محبت جو فنا کا سب سے آسان مگر پرخطر راستہ ہے حسین اُس راستے پر دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے انجام تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اغول جو صرف منزل کا سراغ تھا وہ اس سراغ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جمیلہ ہاشمی نے حسین کی زندگی کے اس گوشے کو بے نقاب کرتے ہوئے عشقِ مجاز کو فنا سے بقا تک کے سفر کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ حسین جو اتصال کا طالب تھا۔ محبت میں فنا ہونا اس کے نزدیک کچھ بھی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو فنا سے بقا اور پھر بقا سے بھی آگے حادث اور قدیم کے باہم اتصال کا آرزومند تھا اور اُس کا یہ جذبہ صرف محبت کی بے پایاں طاقت کی بدولت تھا۔ اہلِ شریعت جو اُس کے جذبے کو الحاد اور گمراہی سے تعبیر کرتے تھے، حسین کی جراُت رندانہ سے خائف تھے۔ اُن کے نزدیک وہ طلبِ صادق کا داعی ضرور تھا مگر اپنی بساط سے بڑھ کر مانگ رہا تھا مگر محبت کا وجود تو بساط کی نفی کرتا ہے، حدود کے تعین سے روکتا ہے قطرے کو کل کا شعور بخشتا ہے اور حسین کو یہ طاقت محبت نے عطا کی تھی۔ حسین مکہ معظمہ سے بغداد واپس پہنچا تو مدرسہ نظامیہ کی مجلس میں حاضری کا خواہش مند تھا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے غلام نے انھیں بتایا کہ حسین اُن سے ملاقات کا متمنی ہے۔

''آؤ حسین آؤ۔ انھوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے کہا...... تم عام زندگی بسر کیوں نہیں کرتے۔ یہ سب اس کی عطا ہے۔''......

''میرا سوال دوسرا ہے، بالکل دوسرا، مختلف، سوالوں سے ماوریٰ۔'' حسین نے ہولے ہولے کہا۔

حسین ازلی اور قدیم حادث سے جدا ہے۔ اپنے مانوس بسیروں کو ترک کر دو، بھائی بندوں کو چھوڑ دو، نامعلوم کو بھلا دو ان سب کی جگہ صرف ذاتِ خداوندی کو یاد رکھو۔ یہ اس کی توحید ہے۔''

کسی مقام پر ازلی اور حادث کا اتصال ممکن نہیں۔ حسین نے بہت پست آواز میں کہا۔

''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ حضرت جنید نے تیزی سے کہا۔ وہ حد ادراک سے ماوریٰ ہے، کوئی شے اُسے احاطہ نہیں کر سکتی، کوئی صفت اس کے لیے کافی نہیں ...... حسین ایسی باتیں تمھیں دار تک لے جائیں گی۔ کیا تم لکڑی کے سرے کو سرخ کرنے کے لیے کوشاں ہو' ' اسلام میں حواس کھونے والے کا کوئی مقام نہیں ...... کیا تم قرمطی ہو' '[۱۲]

حسین جس کے دل میں قدیم اور حادث کے اتصال کی آرزو تھی، اس کی مسکراہٹ میں عجیب مایوسی اور سرخوشی تھی۔ اُسے قرمطی کا خطاب اور دار کی خوش خبری مل تھی۔ وہ راندۂ درگاہ قرار دیا جا چکا تھا۔ وہ جو عشق کو ابن السبیل سمجھتے ہوئے ہر ایک مقام سے گزر جانا چاہتا تھا۔ اُس کے نزدیک فنا، فنا سے اور بقا، بقا سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ تو اتصال کا خواہش مند تھا اور شبلی اپنی گدڑی کو اپنے گرد لپیٹے، پھول کی پنکھڑیوں کو الگ الگ کرتے فنا فنا کی صدائیں لگا رہے تھے۔

حسین کو اپنے ہوش و حواس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ محبت میں دیوانگی کے مقام کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔ ایسی دیوانگی جس میں سرشاری ہو اور فنا کے ساتھ بقا بھی، قدیم سے حادث کا اتصال اور ہر مقام سے گزر جانے کی سند بھی مگر یہ تبھی ممکن تھا جب دار کی لکڑی کو خون سے سرخ کیا جائے۔ جب مجاز سے حقیقت اور حقیقت سے ''انا الحق'' کا مقام آنکھوں کے سامنے ہو اور پھر یہی ہوا حسین کے منہ سے ''انا الحق'' کی صدائیں نکلیں۔ ہر طرف فضا میں ایک ہی صدا گونجنے لگی۔ ''انا الحق''، ''انا الحق'' قدیم حادث سے متصل تھا اور وہ جسے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا تھا اپنی مشیت پر خوش تھا۔ مدرسہ نظامیہ کے سارے فقیہ اس کی موت کے فتوے پر مہریں ثبت کر رہے تھے مگر اس کا وجود فنا کے باوجود ''انا الحق'' کی صداؤں سے بقا کو دوام بخش رہا تھا۔

ایسے میں شرکا ءکا آقا عزازیل مایوسی کا لبادہ اوڑھے حسین کے روبرو کھڑا تھا۔

''تم انا الحق'' کہتے ہو اور تمھارا انجام دار ہو گا۔

''کیا تم اپنے انجام سے باخبر نہ تھے۔'' حسین نے پوچھا۔

''عرشیوں میں صرف میں ہی باخبر تھا اور میں راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔ تم بھی غرورِ ذات سے ''انا الحق'' کہتے تھے اور تم شہید قرار دے دیے جاؤ گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔؟''

تم بھی شہید ازل ہو مگر تم نے اپنے آپ کو ہر حکم سے بالاتر سمجھ لیا تھا۔ میری محبت میں نیاز تھا اور تمھاری محبت میں ناز اور وہ جو کسی لفظ اور کسی تقدس کے بیان کیے جانے کا محتاج نہیں، وہ نہ نیاز جانتا تھا ہے نہ ناز، اُسے جو پسند آ جائے کیا تم اپنے آپ کو اس

درمیان سے نکال نہ سکتے تھے۔"

"نہیں، حسین ابن منصور یہ مشیت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو سب ممکن تھا۔ اس نے مجھے اپنی بادشاہت سے نکال دیا تو مجھ سے بڑھ کر اُس کا چاہنے والا کون ہے۔"

> اُس کی آواز کے تمسخر کو حسین نے محسوس کیا اور کہا، نہیں...... مجھے چاہت کا دعویٰ نہیں۔ مجھے تو کوئی دعویٰ ہی نہیں۔ ہاں تمھارے اور میرے شوق میں فرق ہے...... نہیں۔ تم انا کے لیے دھکیلے گئے تھے۔ میں تو کہیں نہیں ہوں۔ سب طرف وہی ہے، وہ ہے جو جلوۂ جاناں، خود جاناں۔"[۵]

حسین کے جسم سے بہنے والا لہو کا ہر ایک قطرہ "انا الحق" کی صدا لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرمستی و سرشاری تھی جب کہ شبلی کی آنکھوں میں آنسو اور جنید اس کے غم سے نڈھال عبدیت سے مشغول اپنے رب کے حضور جھکے ہوئے۔ قاضی ابو عمر اور قاضی ابو الحسین اس خونِ ناحق کا بوجھ حامد کی گردن پر ڈال رہے تھے اور خدا سے مغفرت کے طالب تھے۔ اہالیانِ شہر حامد بن عباس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جس نے قدیم اور حادث کے اتصال کے خواہش مند کو اپنی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا تھا اور حسین فنا سے بقا تک کے اس سفر میں کامیاب و کامران اپنے جسم و جاں سے بے نیاز ابدیت کے لافانی مقام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں قدیم اور حادث یک جان ہونے کے لیے بے تاب رہتے ہیں اور اسرار ارض و سما کھلنے لگتے ہیں۔ فنا، فنا ہو جاتی ہے اور بقا ابدیت کا روپ دھار لیتی ہے مگر یہ سب تب ممکن ہے جب کوئی "اغول" میسر آ جائے۔ محبت جو اپنی ذات میں فنا اور بقا دونوں کا جوہر لیے کائنات میں اپنے حقیقی وجود کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی تابناکی سے صرف وہی فروزاں ہو سکتا ہے۔ جو صدقِ دل سے اس کے پرخطر راستوں سے گزرنے کا آرزومند ہو۔

"دشتِ سوس" کا بنیادی موضوع حسین بن منصور حلاج کی زندگی، اُس کی ذات اور اُس کا کردار ہے مگر تاریخ اسلام کی اس منفرد مگر متنازع شخصیت کو جمیلہ ہاشمی نے جس احسن اور بھرپور انداز میں ناول کے قالب میں ڈھالا ہے یہ اردو ناول کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے جہاں منصور حلاج کی زندگی کے نہاں گوشوں پر کھل کر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں حسین بن منصور کے بارے میں پیدا شدہ اُن غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا گیا ہے جو صدیوں سے کسی نہ کسی شکل میں زیرِ بحث رہی ہیں۔

عشق جو ادب کا پسندیدہ موضوع رہا ہے ناول کا وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد انسانی زندگی کا تمام فلسفۂ حیات گردش کرتا ہے۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی ادب پارے میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں ایک ساتھ محوِ سفر ہوں اور ناول کے پلاٹ کو ٹھیس بھی نہ پہنچے۔ تاہم دشتِ سوس میں جہاں عشقِ مجازی کی سرمستی موجود ہے وہاں عشقِ حقیقی کی سرشاری اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے اور یہی امتزاج اس ناول کا حسن ہے۔

عشق جس کا جوہر فنا ہے عصرِ حاضر میں اس کا وجود عنقا ہے۔ مادیت پرستی اور نفسا نفسی کے اس کٹھن دور میں جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول جہاں گم شدہ ماضی کو حال کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے وہاں دورِ حاضر کے مشینی انسان کو اُن خوابوں کی تعبیر بھی بتاتا ہے جو خواہشات

کے روپ میں جنم تو لیتے ہیں مگر اُن کی تکمیل کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی۔

حسین بن منصور انسانی فطرت کے اس بکھرے ہوئے وجود کی تکمیل کا دوسرا نام ہے جو بے بس بھی ہے اور با اختیار بھی جو نا کام بھی ہے اور بامراد بھی ہے۔ وہ انسان جسے محبت کی پاداش میں طرح طرح کے مصائب جھیلنے پڑتے ہیں، جسے اپنے جنون کی قیمت جان کا نذرانہ دے کر ادا کرنا پڑتی ہے۔ وہ انسان جو کبھی دوسروں کے لیے مسیحا ہوتا ہے اور کبھی خود اپنے لیے باعث ایذا۔ شاید یہی انسانی فطرت ہے اور اسی کو زندگی کہتے ہیں، مگر عشق کی سلامتی اور کردار کی پختگی انسان کو اس کے وجود سمیت تبھی لازوال کرتی ہے جب تک وہ لا حاصل کو حاصل میں تبدیل نہیں کر لیتا۔

عام طور پر لوگ دوسروں کی تقلید کو منزل کی کلید سمجھتے ہیں مگر منصور حلاج لوگوں کے مروج راستوں سے ہٹ کر نئے اور منفرد راستوں کو تلاشنے کا پیغام دیتا ہے۔ وہ عشق میں فنا کو جسے آخری درجہ کی سند حاصل ہے، عام خیال کرتے ہوئے ایک ایسی تمنا کا طالب ہے جس کا انجام موت کی سزا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے مقدر پر نازاں ہے۔ وہ "انا الحق" کا داعی تو ہے مگر اپنے وجود کے اظہار کا دعویٰ دار نہیں۔ وہ خودی اور انانیت کی معراج، بے خودی، نفی اور نیاز کو سمجھتا ہے۔ وہ اس عقیدت کا پرچارک ہے کہ "میں" کہیں بھی نہیں ہر سو "تو" ہی "تو" ہے۔ اُس کو معلوم ہے ہست سے صرف ایک ذات ہے، باقی سب نیست اور یہی محبت کا جوہر بھی۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ "اغول" سے دور رہ کر بھی اس کی روح پر حکمران ہے اور حامد بن عباس "اغول" کے وجود کو پا کر بھی نا کام و نا مراد۔ وہ ایسے وصال کی نفی کرتا ہے جس میں نہ تو فنا ہے نہ بقا اور نہ باہم اتصال۔ یہی وہ فلسفہ و فکر ہے جس کے نابود ہونے سے آج کا انسان سب کچھ پا کر بھی بے چین و بے قرار ہے اور اس بے چینی و بے قراری نے اسی لیے آج کے انسان کو انسان کم اور منفی زیادہ بنا دیا ہے اور دُور دار پر لٹکا حسین بن منصور کتنے سکون سے پکارتا ہے۔ "انا الحق"، "انا الحق"۔ اُس کی فنا میں اُس کی بقا ہے اُس کی موت میں اس کی زندگی پوشیدہ ہے جب کہ دوسری طرف سماج میں زندہ لاشوں کی بھیڑ، جن میں نہ کوئی جذبہ ہے نہ کوئی جنون، نہ کوئی خواب ہے نہ کوئی تعبیر صرف فنا ہی فنا، فقط موت ہی موت۔

حواشی

۱ علی بن عثمان الہجویری، (ترجمہ) واحد بخش سیال، کشف المحجوب۔ (ص ۶۲۷۔۸۶۲) الفیصل ناشران، لاہور ۱۹۹۹ء

۲ ایضاً، (ص ۴۰۲)

۳ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس۔ (ص ۳۷)، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء

۴ ایضاً، (ص ۲۳۲۔۳۳۲)

۵ ایضاً، (ص ۹۸۲۔۰۹۲)

حسن کوزہ گر۔ تحسینِ راشد کے نیم مخفی گوشے

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

اردو شاعری ایک لگی بندھی شاہراہ پر چلی جا رہی تھی کہ بعض نئے نقادوں نے اس شاعری کے پرانے پن کے ان نقائص کی طرف اشارے کرنا شروع کیے جن کی وجہ سے، ان کے خیال میں، اس شاعری کے اظہاری سانچے کسی مختلف مزاج اور تصورِ زیست کے حامل فرد کے انفرادی لب و لہجے اور احساسات کو سہارنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ کہا گیا کہ اس کے مخصوص علائم و رموز اور لفظیات صدیوں سے استعمال کی وجہ سے اتنے متحجر ہو گئے ہیں کہ اس میں نئے شاعرانہ تجربات اور محسوسات کو بروئے اظہار لانے کی سکت نہیں رہ گئی۔ بات اور آگے چلی تو اس مخصوص لفظیات و استعارات کے ساتھ ساتھ اس کی بعض اصناف خصوصاً ''غزل'' اور اس کی ہیئتی بناوٹ بھی نئے اظہارات کی راہ میں رکاوٹ بتائی گئی۔ یہ شکایت اگر محض چند نقادوں ہی کی طرف سے ہوتی تو شاید اَن سنی ہو کر رہ جاتی مگر جب کوئی تخلیقی فن کار بھی پرانے پیمانوں کے ناکافی و تنگ ظرف ہونے کا شاکی ہونے لگے تو بات ذرا مختلف ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ فنکار مجرد بحثیں ہی نہیں کرتا بلکہ تا بہ مقدور اظہار کے ایسے وسائل بھی تلاش کرتا ہے جو پرانے سانچوں سے مختلف بھی ہوں اور اس ''جوہر'' سے بھی مالامال ہوں جس کی بنا پر اظہار محض بیان نہیں رہتا بلکہ فنی تخلیق کا عملی نمونہ بھی بن جاتا ہے۔

اردو شاعری اسی لگی بندھی ڈگر پر چلی جا رہی تھی کہ اس میں ن م راشد ایسا تخلیقی فن کار پیدا ہوا جس نے اردو شاعری کے پرانے بنے بنائے سانچوں کے ناکافی ہونے کی طرف نہ صرف یہ کہ تنقیدی زبان سے اشارے کیے بلکہ اس سے کہیں آگے بڑھ کر وہ فن بھی تخلیق کر کے دکھایا جو اس کے تئیں ان عیوب سے پاک تھا جن کے سبب اردو کی رسمی شاعری انفرادی خد و خال سے محروم ہو گئی تھی۔ یہ راشد کا وہ امتیاز ہے جو اگرچہ اس کا واحد جوہر نہیں لیکن جوہری امتیاز ضرور ہے۔

راشد پر ایسا دور تو کوئی بھی نہیں گزرا کہ اس کی طرف اس کے دانشور قاری کی توجہ کم ہوئی ہو لیکن ۲۰۱۰ء کا سال راشد شناسی کی ایک تازہ لہر کا سال ضرور ثابت ہوا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے تعلیمی و ثقافتی اداروں نے اس برس ''راشد کے سوویں جنم دن کے برس'' کو راشد پر خصوصی سیمیناروں کے انعقاد اور اس کی مختلف جہات پر کتابوں کی اشاعت کا سال بنا کر راشد کی طرف اہلِ دانش کی دلچسپی کا بجا اظہار کیا ہے۔ یہ رو محض ایک فیشن کی دوڑ ثابت ہو گی یا کچھ اور، اس کا اندازہ ابھی نہیں، آگے چل کر ہو گا۔

پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج کی عمومی شہرت اگرچہ ایک ثقہ کلاسیکی علمی و تدریسی ادارے کی رہی ہے، مگر اس برس راشد شناسی کے حوالے سے بھی اس کی طرف سے متعدد ایسی کاوشیں سامنے آئی ہیں جو اسے جدید مزاج سے بھی ہم آہنگ بنائے دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو سے طویل عرصہ تک وابستہ رہ کر حال ہی میں وہاں سے صدر شعبۂ اردو کے طور پر ریٹائر ہو گئے ہیں۔ یوں تو ان کی ساری زندگی ہی علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں بسر ہوئی ہے مگر اپنی ملازمت کے آخری برس میں تو انھوں نے علم کی اس شمع کو واقعۃً دونوں طرف سے اس طرح جلایا کہ سال ۲۰۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں انھوں نے شعبۂ اردو کے اپنے دیگر رفقائے کار کے ساتھ مل کر ایک بین الاقوامی آزاد صدی سیمینار کا انعقاد کیا۔ محمد حسین آزاد سے متعلق متعدد کتابیں شائع کیں۔ شعبۂ اردو کے مجلّے ''بازیافت'' کے سولھویں شمارے میں ایک خصوصی گوشۂ آزاد شامل کیا اور پھر اسی سال اردو کے نامور جدید شاعر راشد پر ایک خصوصی منصوبہ کا آغاز کرتے ہوئے ''بازیافت'' کا ایک پورا شمارہ مطالعۂ راشد کے لیے وقف کیا۔ یہی نہیں بلکہ ''کس دھنک سے مرے رنگ آئے'' اور ''حسن کوزہ گر'' کے عنوان سے راشد پر خصوصی کتابیں بھی شائع

کیں۔اول الذکر کتاب راشد پر متعدد اہلِ قلم کے مضامین کا انتخاب ہے جو اس کے مرتبین ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر ضیاءالحسن کے حسنِ ذوق کا ثبوت ہے، جب کہ دوسری کتاب ''حسن کوزہ گر'' کے مصنف تحسین فراقی خود ہیں۔

ہم نے اوپر اورینٹل کالج کی عمومی اختصاصی شہرت کا ذکر اس کی شاندار ثقہ تدریسی، علمی اور تحقیقی روایت کے حوالہ سے کیا ہے۔یہی بات کسی مبالغہ کے بغیر ڈاکٹر تحسین فراقی کی شخصی زندگی، عملی رجحانات، درس وتدریس سے اٹوٹ وابستگی، انتھک محنت اور ادب وتحقیق کی کلاسیکی روایت کے ایک محتاط امانت دار ہونے کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اور ثبوت میں ان کی طویل تصنیفی فتوحات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ایک قاری کو اس وقت خوشگوار حیرت ہوتی ہے جب اسے اس کلاسیکی مزاج اور ثقہ ذہن میں راشد جیسے جدید طرزِ احساس کے حامل شاعر کی رسائی اور رسائی بھی نظر آتی ہے۔راشد سے ان کی دلچسپی کوئی نئی بات نہیں لیکن گذشتہ کچھ برسوں کے دوران انھوں نے عملاً بھی راشد کو اپنا موضوعِ تحقیق بنا رکھا ہے اور اس کے لیے ایک ایسا علاقہ منتخب کیا ہے جو اب تک راشد شناسوں کی توجہ سے بوجوہ اوجھل یا ذہنی عدم مناسبت کی وجہ سے نظر انداز تھا۔یہ امر معلوم ہے کہ راشد کو اپنے ابتدائی مذہبی وقومی شعور، ذہنی تربیت اور اپنے دور کے عمومی ماحول کی وجہ سے فارسی زبان وادب، اس کے علائم واساطیر اور تہذیبی وثقافتی مظاہر سے شدید دلچسپی رہی ہے۔ اس ''مفرس مزاج'' کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ ان کا بعد کا جدیدیت پسندانہ طرزِ احساس اور ماضی سے بے رغبتی بھی اسے ختم نہیں کر سکی، بلکہ ایک خلاق فن کار کے طور پر انھوں نے نہایت کامیابی سے فارسی لفظیات وتراکیب اور اس کی اساطیری وعلائمی فضا کو اپنی شاعری میں اس خوبی سے سمو دیا کہ ان کی شاعری، اردو شاعری کے روایتی مزاج وکائنات سے قطبین کا اختلاف رکھنے کے باوجود ظاہری نظر میں اپنے ڈکشن کی حد تک اقبال کی ایک سیکولر توسیع معلوم ہوتی ہے[۱]

ایک تو فارسی سے یہ خلقی دلچسپی اور اس پر مستزاد یہ کہ اتفاقاتِ زمانہ کی وجہ سے راشد کو ایران میں دوبارہ قیام کا موقع ملا۔ ان کا قیام ایران دورانیہ کے اعتبار سے کم ہو یا زیادہ، اس سے قطعِ نظر، اہم بات یہ ہے کہ اپنی طبعی زودرسی کی بنا پر وہاں انھوں نے استعمار کی چیرہ دستی اور اقوامِ شرق کی بے حسی وزوال آمادگی کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا بلکہ اسے اپنے شعری وجدان کا جز و بھی بنایا۔یہ کام اگرچہ وہ پہلے بھی کر رہے تھے مگر سرزمین ایران میں یہ سب کچھ ان کے لیے ذاتی تجربہ بن گیا تھا۔

فارسی کے ثقافتی وادبی ماحول سے فطری مناسبت کی وجہ سے گو علامتِ شعری کے طور پر راشد نے خود کو ''ایران میں اجنبی'' کہا تھا، مگر وہاں وہ کبھی غیر نہیں سمجھے گئے۔ایران کے ادبی وتمدنی حلقوں میں وہ ہمیشہ بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے۔اپنے دور کے تمام ایرانی اہلِ دانش سے ان کے قریبی روابط رہے اور ان لوگوں نے بھی راشد کو ایک اہم معاصر شاعر کے طور پر دیکھا۔مختلف موقعوں پر ایرانی رسائل وجرائد نے ان کے انٹرویوز اور مصاحبہ نما مضامین بھی شائع کیے، کیوں کہ انھیں جدید ایرانی شاعری اور راشد میں گہری یگانگت محسوس ہوتی تھی۔

یہی وہ موقع ہے جہاں سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے فارسی زبان وادب کے ذوق اور ایران اور اس کے ثقافتی ماحول سے اپنی مزاجی مناسبت کی وجہ سے وہاں اپنے طویل قیام کے دوران راشد کو ایک اعتبار سے نئے سرے سے دریافت کیا اور اپنے حاصلاتِ تحقیق سے پاکستانی راشد شناسوں کو ایران میں راشد کے بعض نسبتاً گم گشتہ یا نیم مخفی گوشوں سے واقف کروانے کا سلسلہ شروع کیا۔ان کی کتاب ''حسن کوزہ'' اسی کاوش کا نتیجہ ہے۔یہ کتاب ایران سے راشد کی دلچسپی اور وہاں ان کی پذیرائی کے بہت سے پہلوؤں سے ہمیں اس طرح متعارف کرواتی ہے کہ اس میں تلاش وجستجو، دریافت وبازیافت اور اخذ وترجمہ یعنی تحسین فراقی کے تحقیقی

تنقیدی مزاج کے جملہ عناصر یک جا نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ مذکور ہوا، ایران میں راشد کو ایک معاصر پاکستانی شاعر کے طور پر جو پذیرائی ملی وہ محض ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جدت طراز شاعر کے طور پر تھی۔ اسی باغیانہ روش کی وجہ سے اپنے سے پہلے کی شاعری اور اس کے موضوعات و مسائل کے بارے میں راشد کے خیالات کوئی اتنے زیادہ قابلِ تحسین نہ تھے۔ پھر راشد کے اپنے دور کے بھی کچھ مسائل و سروکار تھے۔ ان سب میں راشد کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ ایران میں چھپنے والے ان کے ان مصاحبوں کو تحسین فراقی نے کھوج نکالا۔ ان کے اصل متون حاصل کیے۔ ان کا ترجمہ کیا اور پاکستان میں انھیں شائع کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنے تمہیدی کلمات، تعارفی معروضات، وضاحتی شذرات اور اختلافی حواشی (جن میں سے بعض انٹرویو کرنے والوں کی غلط فہمیوں سے متعلق ہیں اور کچھ راشد کی تعبیرات و مؤقفات کے حوالے سے) نے ان مصاحبوں کی اہمیت کو کئی گنا بڑھا دیا۔ مصاحبوں میں راشد کی جن نظموں کے فارسی تراجم دیے گئے ہیں، فراقی صاحب نے ان کا اصل اردو متن بھی شاملِ کتاب کر دیا ہے، بلکہ راشد کی بعض نظموں کے مختلف متون کی طرف بھی تقابلی اشارے کیے ہیں اور مروج کلیاتِ راشد میں مندرج ان کی بعض نظموں اور مصرعوں کی صحت متن کے حوالہ سے بھی چند اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔

یہ تو ہوا دریافت اور اخذ و تحقیق کا معاملہ۔ اس کتاب کا ایک وقیع جز و جو بقامت کہتر و بہ قیمت بہتر کی ذیل میں آتا ہے وہ راشد کے بعض شعری و فکری رجحانات کے حوالے سے صاحب کتاب کی اپنی تعبیرات و توضیحات ہیں، جن میں سے زیادہ تر تو ان کے طویل مقالہ "انھیں کیا خبر کہ کس دھنک سے میرے رنگ آئے" میں زیر بحث آئی ہیں اور کچھ ان کے اختلافی حواشی و تعلیقات ہیں۔

راشد نے گو باقاعدہ تنقید تو نہیں لکھی لیکن شاعری، ترقی پسند و جدید نظریۂ ادب، سماج، سیاست اور فن سے ان کے تعلق، استعمار اور ملکی و بین الاقوامی حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس کا اظہار نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ ان کی متعدد نثری تحریروں اور احباب کے نام ان کے خطوط میں بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ نثری تحریریں اور خطوط متعدد رسائل اور بعد ازاں کتابی صورت میں شائع بھی ہو چکے ہیں[۲] لیکن امکان ہے کہ ان کے کچھ مزید خطوط بھی ہوں گے جو ہنوز شائع نہیں ہوئے۔ زیر نظر کتاب میں معروف پنجابی شاعر اور فرانسیسی زبان دان ڈاکٹر لئیق بابری کے نام لکھے گئے راشد کے پانچ غیر شائع شدہ خطوط بھی مع عکسی نقول شامل ہیں جن سے دیگر بہت سی اہم باتوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راشد کی کچھ نظمیں ڈاکٹر لئیق بابری نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کی تھیں اور راشد نے انھیں پسند بھی کیا تھا۔

لیکن یہاں خط نمبر ا کے اس اندراج پر ذرا تعجب ہوتا ہے کہ راشد اپنی ان مترجمہ نظموں کو فرانسیسی تراجم سے کیوں فارسی میں ترجمہ کروا کر شائع کروانا چاہتے تھے[۳] براہ راست اردو سے فارسی میں ترجمہ کروانے میں کیا مضایقہ تھا؟ بہر کیف "حسن کوزہ گر" میں راشد شناسی کے متعدد نیم مخفی گوشے سامنے آتے ہیں اور راشد پسندوں کے لیے مہمیز فکر کا کام دیتے ہیں۔

حواشی

۱۔ جی ہاں۔ یہ راقم کی سوچی سمجھی رائے ہے۔ راشد اگر اقبال کی توسیع ہیں، جیسا کہ بعض ناقدین کا خیال ہے تو یہ ایک سیکولر توسیع ہے۔ اقبال کے شعر و فکر سے جس انسان دوستی کا آغاز ایک دینی و مذہبی فضا کے پس منظر میں اور اختتام "بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست" پر ہوتا ہے وہ راشد کے ہاں آ کر خالص "دنیاوی مضمرات" کا حامل ہیومنزم بن جاتی ہے۔ راقم اس مسئلے پر اپنے خیالات اپنے ایک الگ مضمون میں پیش کرے گا۔

۲۔ اس حوالے سے دو کتابیں بہت اچھی آ گئی ہیں۔ ایک "مقالات راشد" مرتبہ شیما مجید، اسلام آباد، دوسری "ن م راشد کے خطوط" مرتبہ نیم عباس احمر، لاہور، ۲۰۰۸ء

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، "حسن کوزہ گر"، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۱۳۹

قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں

ذکیہ مراد

۱۷/اگست ۲۰۱۰ء

قائد کا پاکستان اور موجودہ صورت حال

صدارت: پروفیسر ڈاکٹر محمد سرور، سابق چیئر مین شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ کالج لاہور

نظامت: جناب محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری، لاہور

مقررین: ڈاکٹر سہراب اسلم، ایئر مارشل (ر) انور محمود خان، میاں عزیز الحق قریشی

قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور نے اپنے علمی وادبی پروگرام کے تسلسل میں مورخہ ۱۷/اگست ۲۰۱۰ء بروز منگل گیارہ بجے صبح ''قائد کا پاکستان اور موجودہ صورت حال'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ جس میں معروف سکالر و دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔ پروگرام کا آغاز محمد مشتاق ہاشمی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ محمد تاج صاحب نے آنے والے مقررین اور سامعین کو خوش آمدید کہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا لینے کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں، یہ مقصد تھا قائداعظم کے پاکستان بنانے کا۔ یہ پاکستان ہم نے قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے کہ یہاں انصاف کا بول بالا ہو اور ہم اپنے عقاید کے مطابق زندگی بسر کر سکیں لیکن افسوس ابھی تک یہاں ایسا کچھ بھی عملاً نہیں ہوا۔

ایئر مارشل (ر) انور محمود خان صاحب نے اظہار خیال فرمایا کہ قائد کا مرتبہ کس قدر بلند ہے اور ان کے افکار کیا تھا۔ ہر طالب علم ان کے اصولوں کے بارے میں پڑھتا رہا ہے۔ انھوں نے قائداعظم کی مختصر الفاظ میں سوانح بیان کی اور کہا کہ پاکستان کی جدوجہد ایک آدمی کی جدوجہد نہیں تھی بلکہ سرسید احمد خان سے لے کر قائداعظم تک کے تمام لوگوں کی تھی۔ انھوں نے ہندوازم کا سامنا کیا اور پھر ان کو شکست بھی دی۔ ۸۰ کی دہائی سے قبل پاکستانی قوم کی پہچان نہایت اونچی تھی لیکن افسوس کہ آہستہ آہستہ حکمران طبقہ نے اس ملک کی قومی حیثیت تبدیل کر دی۔ اس وقت آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مہنگائی، بے روزگاری اور لیڈر شپ کی انتہائی کمی کی وجہ سے ملک درست سمت نہیں جا رہا۔ کسی حکمران نے اس ملک کے موجودہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری طرف افراد قوم میں بے انصافی اور بے راہ روی رچ بس گئی ہے۔ یہ ساری کمی یا خلا ہماری ناپسندیدہ شخصیات کے چناؤ کی وجہ سے ہے۔ یہاں پر ایک انسان کی ٹانگ توڑنے والے کی سزا ہے لیکن ملک توڑنے والوں کے لیے کوئی سزا نہیں، کیا قائد یہی چاہتے تھے؟

نہیں ......

عزیز الحق قریشی نے قرآن پاک کی آیات سے اپنا بیان شروع کیا۔انھوں نے قائداعظم کے مختلف موقعوں پر کی گئی تقاریر کے کچھ حصے پیش کیے اور کہا کہ پاکستان رمضان المبارک میں ہی معرض وجود میں آیا تھا اس مرتبہ پاکستان کی سالگرہ رمضان المبارک میں آئی ہے۔ان دنوں بہت خونی سیلاب آیا تھا اور بہت سی قربانیاں دی گئی تھیں اور آج بھی پاکستان ایک کڑے دور سے گزر رہا ہے۔الیکشن میں ۳۴فی صد ووٹ ڈالا جاتا ہے۔غلط آدمی کا حکمران کے لیے چناؤ یہ اصل وجہ ہے کہ عوام الناس کا ووٹ نہیں آتا۔آج اگر پاکستان کا کوئی قابل لیڈر ہے تو وہ صرف اور صرف ''پاکستانی قوم'' ہیں۔خدارا اپنا منصب پہچانیے اور آج کے پاکستان کو قائد کا پاکستان بنایئے۔

ڈاکٹر سہراب اسلم نے قائداعظم کی شخصیت کے عظیم پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ہی پاکستانی قوم نہ جھکنے والی اور نا قابل شکست قوم کہلاتی تھی۔انہوں نے تاریخ پاک و ہند پر بریفنگ دی اور سال بہ سال پاکستان کی تنزلی کی داستان پیش کی۔

اس کے بعد صدر مجلس نے سامعین اور مقررین کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے کہا کہ یہ مملکت ایک مشن کے تحت قائم کی گئی اور اس کے بانی اس مشن کے امین تھے۔آج کا پاکستان آدھا پاکستان ہے لیکن اس کی اہمیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں ایک پولیٹیکل سسٹم، معاشی سسٹم اور سوشل سسٹم رائج تھا۔آج پاکستان ڈوب رہا ہے یہ صرف اس لیے کہ ہم نے اس سسٹم پر عمل نہیں کیا۔جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا جب ہم اس مقصد کو چھوڑ دیں گے تو پھر ہو گا وہی جو آج کی صورت حال ہے۔عوام میں شعور ہو گا تو حکمران نہیں بلکہ عوام Rulers ہیں۔

آخر میں سوال و جواب کا سیشن نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا گیا۔

۲۸ستمبر ۲۰۱۰ء

تعزیتی ریفرنس ڈاکٹر وزیر آغا

صدارت: شہزاد احمد، مدیر مجلّہ مخزن قائداعظم لائبریری

نظامت: محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری، لاہور

مقررین: ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ضیاء الحسن، شاہد شیدائی، پروفیسر حمیدہ شاہین، آغا سلیم قزلباش

اردو زبان و ادب کے نقیب ڈاکٹر وزیر آغا مورخہ ۷ستمبر ۲۰۱۰ء کو وطن عزیز کے علمی و ادبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے قائداعظم لائبریری نے اقبال ہال میں ۲۸ستمبر ۲۰۱۰ء کو بوقت ۱۱ بجے صبح ایک تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا جس میں ملک کے نامور ادیب و دانشوروں نے اپنے تاثرات پیش کیے۔حسب معمول پروگرام کا آغاز حافظ محمد سعید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور محمد تاج صاحب نے نظامت کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک منفرد انشائیہ نگار تھے ان کی اردو ادب کے لیے خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کے نواسے ''علی عباس''

قانون کے طالب علم ہیں جن کا ادب سے واسطہ بہت کم ہے، انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک نظم پیش کی۔

جناب شاہد شیدائی صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی خدمات کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے کہا مرحوم پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈر تھے۔ وہ کھیتی باڑی کے ساتھ اردو ادب کے لیے بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف اہم ادبی رسائل کے مدیر رہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد ۴۰ سے متجاوز ہے اور ان کے فن پر لکھی گئی کتابیں الگ ہیں۔ وہ زندگی کے آخری ایام تک نظمیں تخلیق کرتے رہے۔

پروفیسر حمیدہ شاہین صاحبہ نے کہا کہ میرا ان کے ساتھ عقیدت کا رشتہ ہے۔ میں نے ان کی ہر تخلیق کو اپنائیت کے ساتھ پڑھا۔ میں نے نومبر ۲۰۰۹ء میں اپنی نظموں کی کتاب مرتب کی اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھجوائی، ان کا ایک ایک لفظ میرے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب نے کہا کہ آغا صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے کچھ کہنا بہت مشکل لگتا ہے، ان کی موت پر ہماری آنکھوں میں بظاہر اشک نہیں ہے لیکن اندر سے اشک رواں ہیں، ان کی شخصیت میں ایک جادوئی کشش تھی۔ ان میں سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ ان میں متاثر کرنے کی خوبی موجود تھی۔ ادب ان کا مرکز ضرور تھا لیکن اس کی تکمیل کے لیے دیگر علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ ادب کے علاوہ ان کا دوسرا مطالعہ Cosmology کا تھا۔ ان کے مطالعہ میں تنوع اور گہرائی تھی۔ ان کا نظریہ مغرب سے مستعار نہیں تھا بلکہ وہ نظری تنقید کے خود موجد تھے۔

پروفیسر ضیاء الحسن صاحب نے کہا کہ ۲۵ سال قبل مجھے ادبی طور پر جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ میری پہچان ڈاکٹر وزیر آغا کی مرہون منت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا نہ صرف ادب میں ایک بڑا مقام تھا بلکہ ذاتی طور پر بھی وہ ایک اچھے مہمان نواز اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، وہ ان ادیبوں میں سے ہیں جن پر ہر دور میں لکھا جاتا رہے گا، انھوں نے ادب کو پڑھنے کے کئی زاویے ایجاد کیے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے مرحوم کی موت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا وزیر آغا ہماری ادبی دنیا کے بے مثال شخص تھے جن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ جن کی یاد ہمارے دل و دماغ میں ایک علمی روشنی پیدا کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر انور سدید صاحب نے کہا کہ ۷ ستمبر کا دن اردو ادب کے لیے بالعموم اور میرے لیے بالخصوص تھا۔ ''اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر'' اور اگر چراغ رخ زیبا مل بھی جائے تو ہم ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم کو واپس نہیں لا سکتے۔

صدر مجلس نے صدارتی کلمات ادا کیے کہ حضرات نے مرحوم کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ مرحوم نے ادب میں مغرب و مشرق کے بہت سے در وا کیے۔ مغرب میں ادب پر جتنی تحریکیں پیدا ہوئی تھیں ان کو مشرق میں اور اردو ادب میں منتقل وزیر آغا صاحب نے کیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آخر میں شاہد شیدائی صاحب نے ایک قرارداد پیش کی اور کہا کہ اردو ادب میں ان کی کمال درجہ کی خدمات اور جہتیں ہیں، ان کے لیے نشان امتیاز کا ایوارڈ دیا جائے۔ یعنی ''کمال فن'' ایوارڈ سے مرحوم کو نوازا جائے۔ یہ تجویز منظور کی گئی اور ریفرنس اپنے اختتام کو پہنچا۔

۲۰ ویں شمارے کے قلمی معاونین

- ڈاکٹرانورسدید صاحب، 172، ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
- افضل توصیف صاحبہ، 318 ، بدر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
- عبدالوحید صاحب، چیف لائبریرین، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
- نسیم بانو صاحبہ، لیکچرر شعبہ اردو، فاطمہ جناح کالج برائے خواتین، چونا منڈی، لاہور
- جاوید رحمانی ،اے بی 401/2 ۔بدھ ویہار۔نئی دہلی ۔47
- ڈاکٹر بصیرہ عنبریں، شعبہ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- ڈاکٹر سلیم اختر ،الجووت c-569 گلی 17 جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
- ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈین سوشل سائنسز، بزنیک یونیوسٹی کراچی
- ڈاکٹر محمد اصغر یزدانی، لیکچرر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، اوکاڑہ
- پروفیسر محمد حنیف شاہد، 170، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
- مسز ساجدہ شبیر، پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، فتح پور، ضلع لیہ
- ڈاکٹر محمد سرور رانا، گلشن راوی، 35 ندیم پارک، لاہور
- حافظ ڈاکٹر صفوان محمد چوہان، ڈی۔ای(کمپیوٹر اینڈ ڈیٹا سروسز) ٹیلی کمیونیکیشن سٹاف کالج، فیصل آباد
- محمد انصاراللہ، دودھ پور، علی گڑھ، انڈیا
- پروفیسر اصغر عباس، گلشن دوست، 4/1085، سرسید نگر، سول لائنز، علی گڑھ، انڈیا 202002
- سید سفیر حیدر، لیکچرار شعبہ اردو، ایف سی کالج، فیروز پور روڈ، لاہور
- مشتاق احمد بیگ، ریسرچ سکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
- ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور
- ذکیہ مراد، لائبریرین، قائداعظم لائبریری لاہور